حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے علومِ شریعت، طریقت اور حقیقت (معرفت)
سے کتابچوں کا سلسلہ

شاہرائے معرفت

کتابچہ نمبر2

جون2019، بمطابق شوال 1440

زیر سرپرستی

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم العالیہ

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمت کو آجکل کی سمجھ میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

مجلس تحقیقات
زین العابدین

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ
مکان نمبر CB-1991/1، بلمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ،
گلی نمبر 4، آشیانہ چوک، اللہ آباد، ویسٹرج 3، راولپنڈی

مضامین کی فہرست

دیباچہ	1
صحابہ رضی اللہ عنہ کی شان	3
اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا مقام	4
امہات المؤمنین رضی اللہ عنہا کا مقام	6
مختصرات سلوک	7
مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ	10
مقامات قطبیہ ومقالات قدسیہ	31
چند ضروری اصطلاحات کی تشریح	48
معیارِ انسانیت اور اس کے حصول کا طریقہ	61
مشکل الفاظ کے معنی	76

دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للہ یہ شاہرائے معرفت پر رواں دواں سالک کے لئے دوسری منزل یعنی دوسرا کتابچہ ہے۔اس میں بھی پہلے کی طرح ابتداء کلام سے کی گئی ہے جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم اہل بیت طہار رضی اللہ عنہم اور اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کی شان بیان کی گئی ہے ایک ہی بحر اور ایک ہی طرز پر جو اہل سنت کی اس عقیدے کے مطابق ہے کہ ان سب کے ساتھ ہم یکساں محبت کرتے ہیں اور "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ" میں ان سب کو شامل سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد مختصرات سلوک کے سلسلے کی ایک مختصر تحریر ہے جس میں اس دفعہ دس مقاماتِ سلوک کا ذکر ہے جس کو طے کرنا سلوک طے کرنا کہلاتا ہے جس کے بعد سیر الی اللہ کی تکمیل ہوجاتی ہے اور سیر فی اللہ جل جلالہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے طریق صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں سیر الی اللہ جل جلالہ کی ضرورت نہیں تھی اور اس کے بعد زمانے کے بُعد کے بقدر اس کی سالکین کو ضرورت ہوتی ہے اور جب یہ طے ہوجاتا ہے تو اس کے بعد اضافی ذکر و مجاہدہ ختم بس صرف وہی شریعت پر استقامت سے چلنا ہوتا ہے جو کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے۔

اس کے بعد حسب معمول حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب نمبر 54 کی تشریح ہے۔اس مکتوب میں بالکل ابتداء میں ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ایمان کے بعد اعمال کی ادائیگی تو ضروری ہے لیکن جب تک اطمینانِ نفس نہ ہو یعنی نفسِ مطمنہ حاصل نہ ہو تو وہ درجہ جو اولیاء کے ساتھ خاص ہے حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں وہ سب شامل ہیں جن کا سلوک ابھی طے نہیں ہوا، اس لئے محض مراقبات کی بنیاد پر جو ولایت کبریٰ کے حصول کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے لئے اس میں خصوصی نظر ہے۔اس مکتوب میں تربیت کے ساتھ ساتھ مقامات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد مقاماتِ قطبیہ ومقالاتِ قدسیہ سے حضرت کاکا صاحبؒ کے اسماء کابیان ہے جس کی مناسب تشریح دی ہوئی ہے اور اس کے بعد حضرت کاکا صاحبؒ کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر ہے جس میں قال اور حال کی خوبصورت تشریح بھی شامل ہے اور ساتھ ہی شریعت ،طریقت اور حقیقت کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے۔اس کے بعد کاکا صاحبؒ کے زُھد اور مجاہدات کے بارے میں بھی ذکر ہے۔اللہ کرے کہ ہمیں حضرت کی زندگی سے اپنی زندگی صحیح طریقے سے گزارنے کی توفیق ہوجائے۔

اس کے بعد مشہور کتاب عبقات سے چند اصطلاحات جن کا الٰہیات میں استعمال ہوتا ہے،کی تشریح بیان کی گئی ہے۔ یہ اصل میں معرفت کے حصول یاعارفین کی باتوں کو سمجھنے کے لئے تیاری ہے۔اس میں مشکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مثال نہیں اور بغیر مثال کے کوئی چیز سمجھ نہیں آتی اس لئے اس سمجھ کے لئے معروف مثالوں کے ذریعے سے پہلے سمجھ کی ترتیب بنائی جاتی ہے پھر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ اور بات ہے کہ عارفین کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہتے ہیں کہ اصطلاحات مبتدی کے لئے سیڑھی کا کام دیتے ہیں اور منتہی کے لئے عیب ہے۔اس لئے ہم اگر حضرت شاہ ولی اللہ ؒاور حضرت مجدد الف ثانی ؒ کے معرفت سے بھری تحریرات سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو ہمیں اس کی ضرورت ہوگی۔اس میں احقر کو حضرت شاہ ولی اللہ ؒ کی طرف سے جو اشارہ ہوا تھا کہ ہمارے وقت میں فلسفہ تھا جس سے لوگ گمراہ ہوتے تھے تو ان فلسفیانہ اصطلاحات کے ذریعے اس کا جواب دیتے ہیں اب سائنس کا دور ہے اس لئے دلائل سائنس کے ہونے چاہئیں۔اس میں اس کی کوشش جابجا ان شاء اللہ نظر آئے گی۔

صحابہ رضی اللہ عنہ کی شان

صحابہ رضی اللہ عنہ کی شان میں بیاں کیا کروں کہ قرآں میں اس کا بیاں ہو چکا ہے

صحابہ رضی اللہ عنہ کا رستہ ہدایت کا معیار
طریقِ نبی یعنی سنت کا معیار
حُب ان کا نبی کی محبت کا معیار

ستارے ہدایت کے ہیں یہ صحابہ رضی اللہ عنہ مقام ان کا سب پر عیاں ہو چکا ہے

یہ حُب صحابہ رضی اللہ عنہ نہ ہو جن کو حاصل
نہ ہو سکتا ہے وہ کبھی حق کا واصل
یہ حق اور باطل کا ہے ایک فاصل

جو بُغضِ صحابہ رضی اللہ عنہ کا داعی بنے تو جو شر ہے وہ اس میں جواں ہو چکا ہے

عقیدہ صحابہ رضی اللہ عنہ کا اصلی عقیدہ
جو ہے مختلف اس سے ،ہے سر بریدہ
کہ باقی شنیدہ ہیں اور وہ ہیں دیدہ

جو غیر انبیاء سے ہیں افضل یہ سارے کہ رب ان پہ یوں مہرباں ہو چکا ہے

کبھی بھی صحابہ رضی اللہ عنہ پہ تنقید نہ کرنا
کہ بارے میں ان کے خدا سے ہے ڈرنا
جو ان سے کٹے، ان کا کیسے سنورنا

تباہی کے رستے کھلے واں پہ شبیرؔ ظلم خود پہ ایسا جہاں ہو چکا ہے

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا مقام

مقام اہل بیت کا بیاں کیا کروں محبت کے آسمان کے تارے ہیں یہ

جو سمجھے کوئی دل میں شانِ رسول
ہو محبوب انہیں خاندانِ رسول
ذرا پڑھ تو لینا فرمانِ رسول

ہے قرآن کے ساتھ عترتی اس میں جب لائق اتباع کے پھر سارے ہیں یہ

خواتین جنت کی ہے سیدہ
جگر گوشہ آقا کی ہے فاطمہ رضی اللہ عنہا
مثالی رہی ہے یوں ان کی حیا

مثالی رہے ہیں یہ سب اہلِ بیت رضی اللہ عنہم، نہیں غیر کے ہیں ہمارے ہیں یہ

شجاعت علی رضی اللہ عنہ کی رہی ہے مثالی
جو ہیں بابِ علم مقام ان کا عالی
سلاسل کے باغِ مقدس کے مالی

یہ گلشن نبی کے ہیں پھول ایسے کہ، جو حق پہ ہیں سب ان کے پیارے ہیں یہ

وہ سردارِ امت اور نام کا حسن رضی اللہ عنہ
فہیم اُمت تھے بچایا چمن
تھے امت کے جوڑ کی امید کی کرن

یہ آقا کے گود میں پلے اور بڑھے ہیں اور آقا کے سچ مچ دلارے ہیں یہ

وہ شیر متقی ، وہ حسین رضی اللہ عنہ، وہ نڈر
کہ حق کے لئے پیش کیا جس نے سر
جب آواز حق اس پہ تھی منحصر
رقم اپنے خون سے کی داستانِ حق ،عجب فکرِ حق کے نظارے ہیں یہ

نبوت، ولایت یہاں دیکھ لو
یہ دل کا کچھ اور ہی جہاں دیکھ لو
شبیرؔ ان کی قربانیاں دیکھ لو
تبھی ساتھ ہونے کا فرمایا ہے کہ دیں پر عمل کے سہارے ہیں یہ

نوٹ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا لفظ اگر اکیلے آئے تو اس میں امہات المؤمنین رضی اللہ عنہا، اہل بیت رضی اللہ عنہم اور سارے باقی صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہوتے ہیں۔

اہل سنت و الجماعت ،صحابہ رضی اللہ عنہ کس کو کہتے ہیں؟

بو بکر رضی اللہ عنہ صحابی ہے تو علی رضی اللہ عنہ بھی صحابی
اور عائشہ رضی اللہ عنہا صحابیہ تو فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے بھی
اور مائیں بھی اپنی صحابیات رضی اللہ عنہا ہی تو ہیں
حسنین صحابہ رضی اللہ عنہ ہیں یہ ان سے جدا نہیں

امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کا مقام

میں ماؤں کا جب بھی مقام سوچوں تو جھکا احترام سے مرا جاتا سر ہے

خدیجہ رضی اللہ عنہا کا جب لب پہ آتا ہے نام
تصور میں میں پیش کردوں سلام
وہ ایثار و قربانی و احترام

نبی کے لئے جو ہمیش کرتی تھیں، ذرا سوچے کوئی کہ وہ کس قدر ہے

حمیرا لقب عائشہ رضی اللہ عنہا ماں ہماری
اشاعت میں دیں کا حصّہ ان کا بھاری
اٹھائی ہے کس شان سے ذمہ داری

ہے قرآن میں ان کی براءت کا اعلان جو ظاہر کہ سب پر کالشمس والقمر ہے

ہمیں ماؤں سے دین کا حصّہ ملا وہ
ہے باقی صحابہ رضی اللہ عنہم سے بالکل چھپا وہ
جو دیں کے لئے تھا ضروری کیا وہ

بغیر اس کے تکمیل دین کیا تھا ممکن، یوں احسان ان کا بہت امت پر ہے

تو بھیجیں ہم ان پہ شبیرؔ اب سلام
رہے دل میں ان کے لئے احترام
ایصالِ ثواب کا بھی ہو اہتمام

کہ ماؤں کا حق ہے مُسلم، وہ سمجھے شرافت کی جس کی کوئی کچھ نظر ہے

مختصراتِ سلوک

تصنیف

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

مقاماتِ سلوک

توبہ، انابت، ریاضت، قناعت، تقویٰ، زہد، صبر، توکل، تسلیم، اور رضا یہ وہ دس مقامات ہیں جن کا تفصیل کے ساتھ طے کرنا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر سالک کے لئے لازمی ہے۔ اس میں توبہ تو رجوع الی اللہ کی ابتداء اور گناہوں سے رُکنا ہے، انابت خیر کے اعمال کی طرف میلان کا بڑھانا ہے ،ریاضت سے جسم کو مشقتوں کا عادی بنانا ہے اور قناعت سے دنیا کی طرف میلان کم کرانا ہے اور زُہد سے نفس کو عمل پر آمادہ کرانا ہے اور تقویٰ ان سب کا لازمی نتیجہ ہے لیکن اس کا عملی نفاذ کرانا ایک الگ شعبہ اور مقام ہے۔ تقویٰ جب حاصل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ انہونی میں ہونا دکھاتا ہے جس سے توکل کو فروغ ہوتا ہے۔اس کے بعد سالک اللہ تعالی کی طرف سے ہر تشریعی یا تکوینی امر کو تسلیم کر لیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ صبر ہے جو پورے دین کی جان ہے۔ اس کے بعد انسان صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ سے قلباً قالباً قالاً اور حالاً راضی ہوتا ہے جس کو مقام رضا کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے بعد سالک فی الحقیقت تو آخرت میں اور بشارتاً اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوجاتا ہے گویا کہ "يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي" کا عملی نمونہ بن جاتا ہے۔ اسی کو نفس مطمئنہ کا مقام کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

اس سے ساتھیوں کو اندازہ ہوگیا ہو گا کہ اصل مقامات کیا ہیں اور دعوے کیا ہیں۔ ان میں سے کونسی چیز ہے جو مراقبہ کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے؟ مثلاً مقام رضا ہی کو لیجئے جو کہ آخری مقام ہے۔اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے کی سوچ ہے اور ایک راضی ہونا ہے۔ یہ سوچ جو ہے راضی ہونے کی اہمیت کے علم اور نفس کے اس پر

راضی ہونے کے درمیان کی حالت ہے۔ یہ درمیان کی حالت تو بیشک کوئی مراقبہ کے ذریعے حاصل کرسکتا ہے جو کہ جذب کسبی میں حاصل ہوجاتی ہے لیکن نفس کا اس پر راضی ہونا یہ نفس کی تربیت و اصلاح کے بعد ہی ممکن ہے جس کے لئے سلوک کا طے کرنا لازم ہے۔ اسی پر حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوب نمبر287 میں زور دیا ہے۔ جب یہ دس مقامات طے ہوجائیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ نفس نے ماننا سیکھ لیا، دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا اور عقل کو بات سمجھ آگئی۔

جب یہ تین چیزیں نفس ، قلب اور عقل درست ہوجائیں تو سیر الی اللہ مکمل ہوجاتی ہے اور سیر فی اللہ شروع ہوجاتی ہے۔ اس سے پہلے نفس نے روح کو جکڑا ہوتا ہے اور نفسانی خواہشات انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں۔ اپنے میں مگن رکھتی ہیں۔اس لئے جیسے ہی نفس سے روح آزاد ہوجاتی ہے تو یہ رکاوٹ دور ہوجاتی ہے اور روح ملاء اعلیٰ جاکر اللہ تعالیٰ کا روحانی مشاہدہ شروع کرلیتی ہے۔ یہ کیفیتِ احسان کا ابتدائی درجہ ہوتا ہے۔ سالک اپنے ارادے سے جتنا جتنا غیر سے اپنے آپ کو یکسو کرتا رہتا ہے اتنی اتنی اس کی کیفیت احسان میں ترقی ہوتی ہے۔ اس وقت قلب روح کے ذریعے لیتا ہے اور نفس مطمئنہ کے ذریعے اپنے آپ پر نافذ کرتا ہے اور نفس کو عبادت میں مشغول کردیتا ہے اور باقی اوقات میں اس سے کیفیتِ حضوری حاصل ہوتی ہے۔ جس وقت عقل قلب کی ایمانی کیفیت سے منور ہوتی ہے اور ایمانی اخبار سے مغلوب ہوجاتی ہے تو اس کا بھی عالم بالا کے ساتھ تعلق ہوجاتا ہے۔اس وقت اس تعلق کی بنیاد پر عقل پر مناسب حقائق کھلتے ہیں اور مکاشفات ہوتے ہیں۔ عقل کی ایسی حالت سِر کہلاتی ہے۔ اس کے ذریعے حقیقت اور فقاہت تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے جس سے ہدایت اور معرفت کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے۔ اسی سے تقویٰ میں ترقی ہورہی ہوتی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں پھر جیسے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جس کی دل کی صفائی زیادہ ہو وہ صدیقین میں ہوجاتا ہے ، جس کے عقل میں صفائی زیادہ ہو وہ علمائے راسخین میں ہوجاتا ہے اور جن کی نفس میں صفائی زیادہ ہوتی ہے وہ زُہاد میں شامل ہوجاتا ہے۔اس طرح یہ سب حضرات گو منتہی کہلاتے ہیں لیکن ان کی تشکیل اپنی اپنی ہوتی ہے۔

اس درجے میں پختگی کی حالت میں مجاہدہ اور مشاہدہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں تو ایسے حضرات میں بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر لمحہ مجاہدہ بھی ہوتا ہے لیکن ساتھ ساتھ مشاہدہ بھی ہورہا ہوتا ہے کیونکہ ان کی نفس کی رکاوٹ بالکل ختم ہوچکی ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے اعمال تو نفس کے ذریعے ہوتے ہیں اور نفس فطرتاً آرام ہی چاہتا ہے تو جس قدر بھی مجاہدہ ہورہا ہوتا ہے اسی لمحے ان کا اتنا ہی مشاہدہ ہورہا ہوتا ہے تو یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ البتہ جو ناپختہ لوگ ہوتے ہیں ان میں ہوسکتاہے کہ دو طرح کے لوگ ہوں

ایک وہ جن کا مجاہدہ ہی نہ ہو اور دوسرے وہ جن کا مجاہدہ تو ہو لیکن مشاہدہ نہ ہو۔ دوسرے قسم کے لوگوں میں مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نفس ان کے اعمال میں سے کچھ حصہ اپنے لئے رکھ لیتا ہے جس سے اپنے اوپر نظر چلی جاتی ہے اور مطلوبہ لِلّٰہیت حاصل نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مجاہدے کا کچھ حصہ بغیر مشاہدے کے چلا جاتا ہے۔ تو اس میں یہ کافی باریک نقطہ ہے۔

مکتوباتِ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

دفتر دوم مکتوب نمبر 54

تشریح و ترتیب

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

سید شاہ محمد کی طرف صادر فرمایا۔ اس بیان میں کہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والسلام کی متابعت کے مراتب و درجات ہیں اور اس کے سات درجے ہیں اور ہر درجے کی دوسرے درجے پر فضیلت اور اس کے مناسب بیان میں۔

حضرت کا جو فیض ہے، الحمدللہ جیسے ہمیں معلوم ہے کہ بہت ساری چیزوں پر ماشاء اللہ چھایا ہوتا ہے۔ لیکن یہ جو حضرت کا خاص فیض ہے کہ کسی کو رُکنے نہیں دیتے۔ یعنی جو بھی مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح معنوں میں مرید ہو گا وہ کسی سٹیج پر رُک نہیں سکتا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ حضرت ہر وقت فرماتے ہیں آگے بڑھو، آگے بڑھو، آگے بڑھو، رُکنا نہیں ہے، رُکنا نہیں ہے۔ اس لئے صحیح معنوں میں حضرت کے مرید رُک نہیں سکتے؟ تو حضرت فرماتے ہیں:

متن۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی○

اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہو۔

آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت جو دینی اور دنیاوی سعادتوں کا سرمایہ ہے وہ کئی درجات و مراتب رکھتی ہے۔

(ا) پہلا درجہ عوام اہلِ اسلام کے لیے ہے یعنی تصدیقِ قلبی کے بعد، اطمینانِ نفس سے پہلے (یعنی نفسِ مطمئنہ حاصل ہونے سے پہلے) جو کہ درجۂ ولایت سے وابستہ ہے احکامِ شرعیہ کا بجا لانا

اور سنتِ سنیہ کی متابعت ہے۔

تشریح۔ تھوڑے سے الفاظ پر ذرا غور کر لیں کہ کیا کیا فرما رہے ہیں۔ اطمینانِ نفس سے پہلے جو کہ درجۂ ولایت سے وابستہ ہے۔ یعنی بغیر اطمینانِ نفس کے ولایت نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہاں مراد تصدیقِ قلبی ہی ہو سکتی ہے، "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ" تصدیقِ قلبی ہو سکتی ہے لیکن اطمینانِ نفس کے لیے کچھ اور کرنا پڑے گا اور اصل ولایت جو ہے وہ اطمینانِ نفس کے بعد ہے۔

اصل میں آجکل کے ہمارے نقشبندی سلسلے کے جو بعض حضرات ہیں وہ پُرانے بزرگوں کے ملفوظات نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض چیزوں میں غلطیوں میں مبتلا ہیں۔ وہ حضرات اصلاحِ نفس کے بعد مقامات جیسے ولایتِ صغریٰ، ولایتِ کُبریٰ کا تذکرہ کرتے تھے تو اُن کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن آجکل لوگ بغیر نفس کی اصلاح کے ان چیزوں کو حاصل ہونا بتاتے ہیں۔ مطلب یہ خیال نہیں کرتے کہ اطمینانِ نفس کے بعد یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے، اس سے پہلے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ تو یہ ولایتِ صغریٰ، ولایتِ کبریٰ، یہ مراقبات سے حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ اللہ پاک نے جو سورۃ شمس اتاری ہے، یہ سورہ شمس کے اندر جتنے زور کے ساتھ اللہ پاک نے فرمایا ہے، " قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا " یقیناً کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، اس کے رذائل کو دبا دیا، یقیناً تباہ و برباد ہو گیا وہ شخص جو ایسا نہیں کر سکا، یعنی اس نے ایسا نہیں کیا۔ اب مجھے بتاؤ آپ جتنے مراقبات کریں گے، اگر اطمینانِ نفس نہ ہو، نفس کی اصلاح نہ ہو چکی ہو، تو "وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا" سے کیسے بچیں گے؟ یہ تو قرآن ہے۔ قرآن تو نصِ قطعی ہے۔اس سے مُفر تو بالکل ممکن نہیں اور یہ بات قابلِ تاویل بھی نہیں۔

پہلے پہلے جب میں نے یہ بات شروع کی تو انگلینڈ سے ایک سوال آیا جو بعد میں یہاں بھی ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ آپ تو کہتے ہیں کہ نفس کی اصلاح کے بغیر یہ چیزیں ممکن نہیں، حالانکہ حدیث شریف میں تو فرمایا گیا ہے کہ دل جسم کا بادشاہ ہے، مطلب یہ کہ دل پاک ہو جائے تو سارا جسم پاک ہو جائے گا، دل خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جائے گا۔ تو آپ حدیث کے خلاف بات کیسے کر رہے ہیں؟

تو اس پر میں نے جواب دیا کہ چلو جی آپ نے تو مجھے حدیث شریف بتا دی، میں آپ کو قرآن پاک کی آیت بتا دیتا ہوں کہ میں نے کہاں سے لیا ہے۔ قرآن میں ہے: " قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا " اس کی ضمیر کس طرف راجع ہے ؟ نفس کی طرف۔ کیونکہ اس سے پہلے قریب ترین " وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا " آیا ہے ،۔ جب قریب چیز موجود ہو تو آپ دور کی طرف تو نہیں جا سکتے۔ تو ضمیر نفس کی طرف راجع ہے۔ لہٰذا جب تک نفس کی اصلاح نہ ہو تو اس وقت تک فلاح ممکن نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ قلب کا ضرور اس میں دخل ہے، کیونکہ قلب کے ذریعے سے نفس اصلاح کے لیے تیار ہو گا۔ جس کو بعد میں جذب کسبی کہا گیا۔ اسی کو تو حضرت بہاؤلدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت کو بدایت میں درج کرنا بتایا لیکن بقول مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ یہ بضرورت تھا کیونکہ اس وقت لوگ بغیر جذب کسبی کے سلوک طے کرنے کا شوق نہیں رکھتے تھے۔یہ اس کے لئے ضروری تھا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ محض صورتاً تھا ورنہ حقیقی جذب اور کسبی جذب میں بہت زیادہ فرق ہے۔اور یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ واقعی دل کا میلان نہ ہو اس وقت تک انسان نفس کی اصلاح کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا، تو دل کی اصلاح فضول نہیں ہے، ضروری ہے، لیکن یہ کافی بھی نہیں ہے۔ بلکہ میرے خیال میں، اپنے بیان میں جو خانقاہ میں ہوا تھا۔اس میں میں نے "Mathematics" کا کلیہ بھی ساتھ بتایا تھا۔ اور یہ عرض کیا تھا کہ "Necessary and Sufficient" یہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔ تو ہماری "mathematics" میں کہتے ہیں، "This is necessary condition but not "sufficient"۔ مطلب ضروری ہے، اس کو حاصل کرنا پڑے گا ، لیکن کافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ ایف ایس سی کرنا میڈیکل کے لیے ضروری ہے، "Necessary condition" لیکن کیا کافی ہے؟ ضروری تو ہے لیکن کافی نہیں ہے۔ تو اسی طریقے سے دل کی اصلاح ضروری ہے۔ بغیر اس کے نفس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لیکن نفس کی اصلاح کے بغیر محض دل کی اصلاح نامکمل ہے۔ خیر بعد میں تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ماشاء اللہ جو مکتوب شریف نمبر (287) آیا تو پھر اس میں تو کافی تفصیلات آئیں۔

یہی چیزیں تو آجکل کے لئے مسئلہ ہیں۔ اصطلاحاتِ قدیمہ جو ہے، اس سے لوگ صحیح فائدہ نہیں اٹھا پاتے اگر وہ حال کے لئے مناسب نہ ہوں ۔اس لیے یہ جو اصطلاحات

ہوتی ہیں، یہ وقتی ہوتی ہیں اور زمانی بھی ہوتی ہیں، مکانی بھی ہوتی ہیں۔

ہمارے گاؤں جہانگیرہ میں دو دریا ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ایک دریائے سندھ اور دوسرا دریائے کابل ہے۔ دریائے کابل کے اُس کنارے پر ہمارے گاؤں کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کو نوے کلے کہتے ہیں۔ نوے کلے میں کمینہ کا لفظ جو ہے وہ خاکسار کو کہتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں وہی معنی ہے جو کہ اردو میں ہے۔ ہمارے ہاں وہ مستعمل ہے۔ درمیان میں صرف دریا ہے۔ اُس طرف کمینہ خاکسار کو کہتے ہیں۔ چونکہ گاوں قریب ہیں اس وجہ سے آپس میں رشتہ داریاں بھی ہیں۔ تو مجھے ایک صاحب اپنا واقعہ بتا رہے تھے کہ بھائی خان ایک بڑے اچھے آدمی تھے، بڑے مالدار تھے، ہانگ کانگ میں انہوں نے کاروبار وغیرہ کیا تھا، تو کافی مالدار تھے۔ لیکن تھے متواضع آدمی، نیک آدمی تھے۔ ان کا کوئی رشتہ دار تھا ہمارے گاؤں کا، تو اُس گاؤں کا ایک آدمی اس کو کہہ رہا ہے، بھائی خان بہت کمینہ ہے۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ میں تو غصے سے بھر گیا کہ اس کو کمینہ کہا۔ قریب تھا کہ میں اس کو کچھ کہتا، کہ اس نے کہا کہ وہ گاڑی میں آ رہے تھے، میرے لیے گاڑی روکی، مجھے اپنے ساتھ سیٹ پر بٹھا لیا، بڑی اچھی باتیں کیں۔ میں نے کہا، اچھا یہ تو کچھ اور کہہ رہا ہے۔ اچھا ہوا کہ میں نے کچھ کہا نہیں۔ اب ٹھیک ہے، بس صحیح ہے، وہاں کمینہ یہ ہے، یہاں کمینہ یہ ہے۔ تو یہ تو مکان کے لحاظ سے ہوا۔ اور زمان کے لحاظ سے یہ بات ہے کہ جو چیزیں جن سے پہلے ایک مطلب لیا جاتا تھا، اور ان سے اب مطلب دوسرا لیا جانے لگے تو کیا خیال ہے اس کو بدلنے کی ضرورت ہو گی یا نہیں؟ وحدت الوجود کے نام کو حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الشہود سے کیوں بدل دیا؟ حالانکہ وحدت الوجود تمام سلسلوں میں موجود تھا، اس کو وحدت الوجود بدون سُکر اور وحدت الوجود بالسُکر کہتے تھے۔ جس کو حضرت مجدد صاحب وحدۃ الشہود کہتے ہیں، اس کو وحدت الوجود بدون سُکر کہتے تھے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں وحدت الوجود بدون سُکر موجو دہے، دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ اور وحدت الوجود بالسُکر وہ ہے جو عمومی طور پر وحدت الوجود کے لیے کہا جاتا ہے۔

اب چونکہ اس سے بہت بڑا مسئلہ ہوا، لوگوں نے اس کو عقیدے کا مسئلہ بنا لیا، کچھ مسائل اور اس میں شامل ہو گئے، وحدت اور کثرت کی باتیں چھڑ گئیں اور بہت سارے

مسائل پیدا ہوئے تو حضرت نے باقاعدہ اس کا لفظ تبدیل کر دیا۔ وحدۃ الشہود بنا دیا۔ اس طرح حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اور بھی تبدیلیاں کی ہیں۔ اس طرح مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بعض چیزیں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تبدیل کی ہیں۔ حالانکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ انہی کے طریقے پر ہیں۔ عبقات میں دیکھ لیں کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک چیز کو ایک اصطلاح کہہ رہے ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس کو دوسری اصطلاح کہہ رہے ہیں۔

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصطلاحات کا تبدیل ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عبقات پر جس وقت ہم نے کام شروع کیا الحمدللہ تو ہمارا ارادہ تھا کہ اس کو نئے سرے سے لکھا جائے تاکہ آجکل کے دور کے لیے قابلِ استفادہ ہو جائے اور آجکل کے لوگ اس سے استفادہ کریں۔ یہ ہماری نیت تھی۔ الحمدللہ۔ لیکن اللہ پاک کی شان، اللہ پاک کی مہربانی، اللہ پاک کا فضل، اس میں ہماری کوئی لیاقت نہیں ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بشارت آئی اور انہوں نے فرمایا صرف یہ نہیں بلکہ آپ اپنی اصطلاحات بھی تبدیل کر لیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تم ہماری اصطلاحات استعمال کرو۔ مقصد حاصل کرنے کے لیے جس اصطلاح کو آپ خود بنانا چاہیں تو بنا لیں۔ یعنی اصطلاح تک سے بھی ہمیں آزاد کر دیا، کہ اصطلاح بھی ضروری نہیں کہ آپ ہمارے والی اصطلاحات رکھ لیں۔ حالانکہ اس پر ہم ابھی تک عمل نہیں کر سکے۔ اصطلاحات حضرت کی ہی چل رہی ہیں، لیکن حضرت نے اجازت دے دی ہے کہ آپ اصطلاحات بھی تبدیل کریں۔ ممکن ہے شاید آگے ضرورت پڑ جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ابھی تو نئے سرے سے شروع کیا ہے۔ لیکن بہرحال کچھ Indication اس قسم کی آگئی ہے کہ شاید ضرورت پڑ جائے کسی وقت کہ اصطلاحات کو بھی تبدیل کر لیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جو اصطلاحات ہیں، ولایتِ کبریٰ، ولایتِ صغریٰ، اس سے حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں روکا ہے کہ یہ اصطلاحات اب استعمال نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس سے لوگوں کو نقصان ہو رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ولی سمجھ رہے ہیں اور جو اپنے آپ کو ولی سمجھ لے پھر اصلاح کیسے ہو گی؟ جب ولایتِ کبریٰ حاصل ہو گئی تو مجھے بتاؤ کہ پھر کیا کرنا ہے؟ پھر اس کے بعد کیا کرنا ہے؟ پھر تو کچھ بھی نہیں کرنا۔

دوسری طرف ہمارے ساتھ کئی واقعات اس طرح ہوئے ہیں کہ یہ کاکا خیلوں

کا شجرہ ہم نے لکھا۔ کاکا صاحب ؒ کا منظوم شجرہ ہم نے پشتو میں لکھا۔ ابھی مکمل ہوا ہی تھا کہ حضرت حلیم گل باباؒ جن کی کتاب مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ ہم پڑھتے تھے، اُن کی زیارت ایک ساتھی کو ہوئی اور فرمایا کہ شبیر نے تو یہ کام کر لیا، لیکن اس میں خطرہ ہے کہ کاکاخیل اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگیں گے۔ تو پھر کیا ہو گا؟ مجھے جب اس ساتھی نے بتایا تو میں نے کہا کہ بات تو صحیح ہے۔ واقعی اگر بزرگ سمجھ لیا تو...

خیر شجرہ تو ماشاء اللہ طویل ہے، پشتو میں ہے، اس کے بعد میں نے پانچ شعروں کا اضافہ کر لیا۔ ان پانچ شعروں میں اس چیز کو Explain کیا کہ اس کو کیسے لینا چاہیے۔ پھر اس کے بعد مبارکباد آ گئی۔ الحمدللہ۔ تو پھر میں نے کاکاخیلوں کو بھیج دیا کہ اب پڑھو اس کو۔

پشتو اشعار...

فاطمې بی بی ته ووې پاک رسول ﷺ خپل عمل ښۀ کړه
تۀ پۀ دغې به خلاصېرې پۀ دې نه چې یم ستا پلار

ترجمہ: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ نے فرمایا، اپنے عمل کو اچھا کر لو، اسی سے تم بچو گی، اس وجہ سے نہیں کہ میں تیرا باپ ہوں۔

دا نسبت دَ سیدانو معتبر پۀ دې دنیا دے
حسن وائی آخرت کښې خپل عمل وی بس پکار

ترجمہ: حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جو سادات کی نسبت ہے، یہ صرف اس دنیا تک ہے، آخرت میں تو عمل ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس کسی کو اس کا عمل پیچھے کر دے، اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔

زۀ پۀ ناز دَ سیدئ کښې عمل پرېږدمه خدایه
دَ شیطان پۀ لمسه نۀ شم جهنم ته زۀ ګزار

ترجمہ: کہیں سید ہونے کے ناز میں عمل نہ چھوڑ دوں۔ کہیں شیطان کے ورغلانے کی وجہ سے میں جہنم میں نہ چلا جاؤں۔

کوم نیکونه چې زمونږ دی دَ عمل واړه غازیان وو
پدرم سلطان نعره دَ بې عملئی اؤ خطا کار

ترجمہ: جو ہمارے دادا تھے، آباؤ اجداد تھے، وہ عمل کے غازی تھے، اور پدرم سلطان کا جو نعرہ ہے، یہ تو بے عملی اور نقصان کا نعرہ ہے۔ جو عمل نہیں کرنا چاہتا تو وہ کہتا ہے پدرم سلطان بود۔

خدایه ما دَ لاف زنئی نه پۀ امان کړې پۀ خپل فضل
پۀ دهوکو دَ نفس شیطان کښې چرته نۀ شم راحصار

ترجمہ: اے اللہ مجھے اپنے فضل سے لاف زنی سے محفوظ رکھیے ، کہیں نفس کے دھوکے سے اور شیطان کی وجہ سے میں کہیں اس میں گھر نہ جاوں۔

تو اصل بات یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں جو بھی ہیں، اچھی بھی ہوں، لیکن ضروری نہیں کہ ہر ایک کے لیے اچھی رہ جائیں۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے، وہ ایک کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے، اور دوسرے کے لیے بہت ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اصطلاحات ساری کی ساری اس کے مطابق ہونی چاہئیں۔

متن۔جو کہ درجۂ ولایت سے وابستہ ہے احکامِ شرعیہ کا بجا لانا اور سنتِ سنیہ کی متابعت ہے۔ اور علمائے ظاہر عابد اور زاہد حضرات جن کا معاملہ ابھی اطمینانِ نفس تک نہیں پہنچا سب اسی متابعت کے درجہ میں شریک ہیں اور اتباع کی ظاہری صورت کے حاصل کرنے میں سب برابر ہیں اور چونکہ اس مقام میں نفس ابھی کفر و انکار پر ہی اڑا ہوا ہوتا ہے اس لیے یہ درجہ متابعت کی صورت کے ساتھ مخصوص ہو گا۔...(یعنی جب تک اتباع کر رہا ہو گا تو وہ ٹھیک ہے، ورنہ نقصان)...متابعت کی یہ صورت، متابعت کی حقیقت کی طرح آخرت کی کامیابی و نجات اور خلاصی کا موجب اور دوزخ کے عذاب سے بچانے والی اور جنت میں داخل ہونے کی خوشخبری دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے اپنے کمال کرم سے نفس کے انکار کا اعتبار نہ کر کے صرف تصدیقِ قلبی پر کفایت فرمائی ہے اور نجات کو اس تصدیق پر وابستہ کیا ہے۔

(یعنی اگر نفس کی مخالفت کر کر کے کوئی عمل کرتا ہے تو ٹھیک ہے ، یعنی اُس کو مان لیا جاتا ہے۔)

(۲) متابعت کا دوسرا درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان اقوال و اعمال کی متابعت ہے جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ (یعنی ظاہری اعمال کی صورت کا تو پہلا درجہ ہے) مثلاً اخلاق کا درست کرنا اور بری عادتوں کا دور کرنا۔ اور باطنی امراض اور اندرونی بیماریوں کا ازالہ کرنا وغیرہ وغیرہ جو مقامِ طریقت سے متعلق ہیں اور اتباع کا یہ درجہ اربابِ سلوک کے ساتھ مخصوص ہے جو طریقۂ صوفیہ کو شیخ مقتدا سے اخذ کر کے سیر الی اللہ کی وادیوں اور جنگلوں کو قطع کرتے ہیں۔

(۳) متابعت کا تیسرا درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان احوال و اذواق اور مواجید کی متابعت ہے۔

تشریح۔ یہاں آپ ﷺ کے ذوق کی بات ہوئی ہے۔ ایک صاحب نے خواب دیکھا، خواب میں آپ ﷺ کی زیارت ہوئی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مصافحہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ہونٹوں پر کچھ پاؤڈر ملا ہوا تھا ، اس کو اشارہ کیا کہ اس کو سونگھو۔ یہ بیدار ہوئے کہ یہ کیسا خواب ہے، مطلب یہ کہ کیا حکم ہے؟ وہ تو مجھے سمجھ نہیں آیا۔ تو انہوں نے ایک صاحب سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اشارہ ہے کہ تم میرے ذوق کی اتباع کرو۔ تو آپ ﷺ کے ذوق کا اتباع تیسرا درجہ ہے۔

متن۔ جو ولایتِ خاصہ کے مقام سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ درجہ ان اربابِ ولایت کے ساتھ مخصوص ہے جو مجذوب سالک یا سالک مجذوب ہوں۔ (صرف مجذوب سالک نہیں فرمایا) جب مرتبۂ ولایت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو نفس بھی مطمئنہ ہو جاتا ہے اور طغیان و سرکشی سے باز آجاتا ہے اور انکار سے اقرار میں اور کفر سے اسلام میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد جس قدر متابعت میں کوشش کرے گا وہ متابعت کی حقیقت ہو گی۔ اگر نماز ادا کرے گا تو متابعت کی حقیقت بجا لائے گا اور اگر روزہ ہو گا تو اس کا بھی یہی حال ہے اور اگر زکوٰۃ ہے تو وہ بھی اسی طریقے پر ہو گی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ شریعت کے تمام احکام بجا لانے میں "حقیقتِ متابعت" شاملِ حال ہو جاتی ہے۔

تشریح۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل حج میں لکھا ہے کہ ایک صاحب نے حج کیا تو حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے پوچھا کہ کیا تمہیں فلاں جگہ پر یہ احساس ہوا تھا؟ انہوں نے کہا، نہیں۔ پھر کسی اور جگہ کے متعلق پوچھا کہ وہاں یہ ہوا تھا؟ تو کہا، نہیں۔ اس طرح مختلف جگہوں کے بارے میں پوچھا کہ وہاں پر تمہیں یہ احساس ہوا تھا؟ جب اُس نے ہر جگہ کے بارے میں کہا کہ نہیں ہوا تھا تو حضرت نے اُس کو کہا کہ جاؤ تم نے حج نہیں کیا دوبارہ حج کرو۔ یہ حقیقتِ حج والی بات تھی۔ مطلب ظاہری صورت میں تو حج ہو گیا۔ بالکل ایسے جیسے انسان نماز پڑھ لیتا ہے تو نماز ہو تو جاتی ہے لیکن آیا وہ حقیقت والی نماز ہے؟ تو حقیقت والی نماز کے لیے پھر حقیقت کا اتباع کرنا پڑے گا۔

متن۔ سوال: نماز و روزہ کی حقیقت کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ نماز و روزہ مخصوص افعال ہیں اگر ان افعال کو (شارع علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق) ادا کیا جائے تو ان کی حقیقت ادا ہو جائے گی، اس کی صورت کیا ہے اور اس سے زیادہ حقیقت کیا ہے؟

(یہ حضرت نے خود سوال قائم کیا ہے۔)

جواب: مبتدی کا نفس چونکہ امارہ ہے لہٰذا بالذات آسمانی احکام کا منکر ہے اور اس سے احکامِ شرعیہ کی بجا آوری ظاہری صورت کے اعتبار سے ہے۔ اور منتہی کا نفس چونکہ مطمئنہ ہو گیا ہے اور اس میں احکامِ شرعیہ کے قبول کرنے کی رضا و رغبت پیدا ہو گئی ہے لہٰذا اس سے احکام کی بجا آوری حقیقت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ مثلاً منافق اور مسلمان دونوں نماز ادا کرتے ہیں لیکن منافق چونکہ باطن میں انکار رکھتا ہے اس لیے وہ نماز کی صرف ظاہری صورت ادا کرتا ہے اور مسلمان باطنی فرمانبرداری کے باعث نماز کی حقیقت سے مزین ہے لہٰذا صورت اور حقیقت کا اعتبار باطنی انکار و اقرار پر مشتمل ہے۔ یہ درجہ یعنی اطمینانِ نفس اور اعمالِ صالحہ کی حقیقت کا درجہ ولایتِ خاصہ کے کمالات کے حصول کے بعد جو درجۂ سوم سے متعلق ہے حاصل ہو جاتا ہے۔

(۴) (متابعت کا) درجۂ چہارم یہ ہے کہ پہلے درجے میں اس مطابعت کی صورت تھی اور یہاں اس اتباع کی حقیقت ہے۔ اتباع کا یہ درجۂ چہارم علمائے راسخین شکر اللہ تعالیٰ سعیھم کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو اطمینانِ نفس کے بعد متابعت کی حقیقت کی دولت سے متحقق ہیں۔ اولیاء اللہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کو تمکینِ قلب کے بعد اگرچہ ایک طرح کا اطمینانِ نفس حاصل ہو جاتا ہے لیکن نفس کو کمال درجہ اطمینان کمالاتِ نبوت کے حصول کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

تشریح۔اب کمالِ نبوت کی باری کب آئے گی؟ چوتھے درجے میں آ گئی اور آج کل لوگ اس کو دوسرے درجے میں حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ کمالاتِ اولوالعزم تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہ کمالاتِ نبوت کب شروع ہوتے ہیں؟ تیسرے درجے کے بعد۔ جب نفس کا اطمینان حاصل ہو جائے یعنی نفس مطمئنہ حاصل ہو جائے اور اُس کے بعد حقیقت

بھی حاصل ہو جائے پھر کمالات نبوت کی باری آتی ہے۔

متن۔جو کہ وراثت کے طور پر ان کمالات سے علماء راسخین کو بھی حصہ حاصل ہے۔ پس علماء راسخین نفس کے کمالِ اطمینان کے باعث شریعت کی حقیقت سے جو اتباع کی حقیقت ہے متحقق ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو چونکہ یہ کمالات حاصل نہیں ہوتے اس لیے کبھی وہ شریعت کی صورت سے متلبس اور کبھی اس کی حقیقت سے متحقق ہوتے ہیں۔

تشریح۔

یہاں حضرت نے علماء راسخین کی بات فرمائی ہے کہ اُن کو اطمینان نفس کی بدولت شریعت کی جو حقیقت ہے اُس کی اتباع نصیب ہوتی ہے۔ جبکہ باقی لوگوں کو چونکہ نفس کا اطمینان حاصل نہیں ہوا ہوتا تو وہ کبھی شریعت کی ظاہری اتباع کرتے ہیں اور کبھی شریعت کے حقیقت کی اتباع کرتے ہیں۔ گویا کہ درمیان درمیان میں ہوتے ہیں آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں۔

متن۔اب ہم علماءِ راسخین کی ایک علامت بیان کرتے ہیں تاکہ ہر ظاہر دان عالم راسخ ہونے کا دعویٰ نہ کرے اور اپنے (نفسِ) امارہ کو مطمئنہ نہ سمجھ بیٹھے۔ عالمِ راسخ وہ ہے جس کو کتاب و سنت کے متشابہات کی تاویل سے بہت حصہ حاصل ہوا اور قرآنِ کریم کی سورتوں کے اوائل میں جو حروفِ مقطعات ہیں ان کے اسرار سے بھی بہرہ ور ہو۔ اور متشابہات کی تاویل بہت ہی پوشیدہ اسرار میں سے ہے۔

تشریح۔حضرت نے صحیح بات فرمائی ہے۔ اپنے ایک مکتوب شریف میں بیان فرمایا کہ جو محکمات ہیں وہ ظاہرِ شریعت ہے۔ اور جو متشابہات ہیں وہ باطنِ شریعت ہے۔

متن۔یہ خیال نہ کریں کہ یہ تاویل ید (ہاتھ) کی قدرت کے

مانند ہے اور وَجہ (چہرہ) کی تاویل ذات سے کرنے کی طرح ہے، کیونکہ یہ تاویل علمِ ظاہر سے پیدا ہوتی ہے اس کا اسرار سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ ان اسرار کے جاننے والے تو انبیاءعلیہم الصلوات والتسلیمات ہیں، اور یہ رموز اُن کے معاملات سے متعلق اشارات ہیں یا وہ حضرات ہیں جن کو تبعیت و وراثت کے طور پر اس دولتِ عظمیٰ سے مشرف کیا جائے۔

اس درجۂ متابعت کا حصول جو نفس کے اطمینان سے وابستہ ہے اور صاحبِ شریعت علیہ و علیٰ آلہ الصلوات والسلام کی متابعت کی حقیقت کا وصول ہے کبھی بغیر واسطۂ فنا و بقا اور کبھی سلوک و جذبہ کے توسل کے بغیر میسر ہو جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ احوال و مواجید اور تجلیات و ظہورات میں سے کچھ بھی درمیان میں نہ آئے اور یہ دولت حاصل ہو جائے۔ لیکن دوسرے راستوں کی نسبت ولایت کی راہ سے اس دولت تک پہنچنا بہت آسان اور اقرب ہے۔ اور وہ دوسرا راستہ اس فقیر کے خیال میں سنتِ سنیہ علیٰ صاحبہا الصلوات والسلام والتحیۃ کی متابعت کا التزام اور بدعت کے اسم و رسم (نام و نشان) سے اجتناب کرنا ہے۔ جب تک بدعتِ حسنہ سے بھی بدعتِ سیئہ کی طرح پرہیز نہ کریں اس وقت تک اس دولت کی خوشبو اس کی جان کے دل و دماغ میں نہ پہنچے گی۔

تشریح۔

گویا کہ سنت اس کے قلب و جگر میں رچ بس جائے، سنت کی خوشبو اس کے قلب و جگر میں رچ بس جائے۔

متن۔ آج یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام جہان دریائے بدعت میں غرق ہو چکا ہے اور بدعت کے اندھیروں میں آرام

سے پڑے ہیں۔ کس کی مجال ہے کہ بدعت کو دور کرنے کا دم مارے اور سنت کے زندہ کرنے میں لب کشائی کرے۔ اس زمانے کے اکثر علماء بدعتوں کو رواج دینے اور سنتوں کو محو کرنے میں مشغول ہیں۔ مروجہ بدعتوں کو مخلوق کا تعامل جان کر ان کے جواز کا بلکہ استحسان کا فتویٰ دیتے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر گمراہی عام پھیل جائے اور باطل متعارف و مشہور ہو جائے تو تعامل (بتکلف عمل بنا لینا) ہو جاتا ہے۔ مگر (علماء) یہ نہیں جانتے کہ یہ تعامل مطلقاً استحسان کی دلیل نہیں ہے۔ وہ تعامل معتبر ہے جو صدرِ اول سے چلا آ رہا ہے

تشریح۔حضرت اصل میں اجماع کی طرف بات لے گئے۔اصل میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ اگر اکثریت کا کسی چیز پر عمل ہونا شروع ہو جائے تو پھر وہی عمل دین ہوتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے بلکہ ہمیں قرون اولیٰ کی طرف دیکھنا ہو گا۔ اگر اُنہوں نے بھی ایسا کیا ہو تو پھر تو ٹھیک ہے ورنہ پھر ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اگر قرون اولی کے ساتھ مخالفت آجائے تو پھر تو وہ دین نہیں رہا۔ کیونکہ تواتر ٹوٹ گیا تو پھر وہ چیز رہی ہی نہیں۔ ہمارے حضرت حلیمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہمیں اپنے بزرگوں نے ایک بات سکھائی تھی جس کا ہمیں معلوم نہیں تھا کہ کیوں۔ بزرگوں نے فرمایا تھا کہ اس کو رٹ لو، کام آ جائے گی۔ چاہے اس وقت سمجھ نہ آئے لیکن اس کو رٹ لو کسی وقت کام آ جائے گی۔ اور وہ یہ تھی کہ دین متواتر ہے، تواتر سے ثابت ہے۔ یہ چھوٹا سا فقرہ ہے، لیکن حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھیں کہ اس کو کہاں فٹ کر رہے ہیں؟ دین متواتر ہے، تواتر سے ثابت ہے۔ اس وجہ سے اگر درمیان میں تواتر ٹوٹ گیا تو پھر وہ دین نہیں رہا، پھر وہ کچھ اور چیز ہو گیا۔ تو حضرت آگے یہ بات فرما رہے ہیں۔

متن۔ یا تمام لوگوں کے اجماع سے حاصل ہوا ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ غیاثیہ میں مذکور ہے کہ "شیخ الامام شہید رحمۃ اللہ علیہ سبحانہٗ فرماتے

ہیں کہ ہم مشائخ بلخ کے استحسان پر فتویٰ نہیں دیتے بلکہ ہم اپنے متقدمین صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں کیونکہ صرف ایک شہر کا تعامل جواز پر دلالت نہیں کرتا بلکہ وہ تعامل جواز پر دلالت کرے گا جو صدرِ اول سے استمرار کے طور پر چلا آ رہا ہے (دین متواتر ہے، تواتر سے ثابت ہے) تاکہ وہ نبی کریم علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والسلام کی تقریر (حدیث کی ایک اصطلاح) پر دلیل ہو (یعنی آپ ﷺ نے جس کو قائم رکھا ہو) اور لوگوں کے لیے نشانِ راہ ہو، تو یہ حقیقت میں آنحضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والسلام کی شریعت ہو گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر لوگوں کا فعل حجت نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تمام شہروں کے بکثرت لوگ اس پر عمل پیرا ہوں تو یہ "اجماع" ہو جائے گا اور اجماع حجت ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اگر کچھ لوگ شراب کی تجارت یا سود کے رواج پر تعامل کریں تو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔

اور اس میں شک نہیں کہ تمام مخلوق کے تعامل کا علم اور تمام دیہات و شہروں کا عمل حاصل کرنا انسان کے احاطہ سے باہر ہے۔ باقی رہا صدرِ اول کا تعامل جو کہ حقیقت میں آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والسلام کی تقریر نے "برقرار رکھا ہوا" ہے اور آنحضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والسلام کی سنت کی طرف راجع ہے۔ اس (تعامل) میں بدعت کہاں اور بدعت حسنہ کیسی؟

اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کو تمام کمالات کے حاصل ہونے میں صحبتِ خیر البشر علیہ وعلیہم الصلوات والتسلیمات کافی تھی، اور علمائے سلف میں سے جو حضرات بھی رسوخ کی اس دولت سے مشرف ہوئے ہیں وہ صوفیہ کے طریقے کو اختیار کیے بغیر اور سلوک و جذبے

کے ساتھ مسافت کو قطع کیے بغیر مشرف ہوئے ہیں اور وہ سنتِ سنیہ علیٰ صاحبہا الصلوات والسلام والتحیہ کی متابعت کے التزام اور بدعتِ ناپسندیدہ سے اجتناب کی وجہ سے اس مرتبہ پر پہنچے ہیں۔ اللھم ثبتنا علی متابعۃ السنۃ وجنبنا عن ارتکاب البدعۃ بحرمۃ صاحب السنۃ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوۃ والسلام والتحیۃ

(۵) متابعت کا پانچواں درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والسلام کے صرف ان کمالات کی اتباع ہے جن کے حاصل ہونے میں علم و عمل کا کوئی دخل نہیں بلکہ ان کا حصول خداوند جل سلطانہٗ کے محض فضل و احسان پر موقوف ہے۔ یہ درجہ نہایت ہی بلند ہے۔ سابقہ درجات کی اس درجے کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں۔ یہی کمالات اولوالعزم انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے ساتھ بالاصالت مخصوص ہیں (یہ ہے کمالاتِ اولوالعزم۔ یہ کونسا درجہ بن گیا؟ پانچواں درجہ۔ کمالاتِ اولوالعزم) اور دوسروں کو تبعیت و وراثت کے طور پر حاصل ہیں۔ دیکھئے اس دولت سے کس کو مشرف فرماتے ہیں۔

(۶) متابعت کا چھٹا درجہ آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے ان کمالات کی اتباع ہے جو آں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کے مقامِ محبوبیت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جس طرح پانچویں درجہ میں کمالات کا فیضان محض فضل و احسان پر تھا اسی طرح اس چھٹے حصے میں بھی ان کمالات کا فیضان محض محبت پر موقوف ہے جو تفضل و احسان سے بالا و برتر ہے۔ متابعت کا یہ درجہ بھی بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ پہلے

درجے کے علاوہ متابعت کے یہ پانچ درجے مقاماتِ عروج کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اُن کا حصول بھی صعود پر وابستہ ہے۔

تشریح۔ یعنی پہلے درجے کے علاوہ متابعت کے جو پانچ درجے ہیں وہ عروج کے ساتھ ہیں۔

متن۔(۷) متابعت کا ساتواں درجہ وہ ہے جو نزول و ہبوط سے تعلق رکھتا ہے۔ اور متابعت کا یہ ساتواں درجہ سابقہ تمام درجات کا جامع ہے کیونکہ اس مقام میں نزول بھی تصدیقِ قلبی ہے اور تمکینِ قلبی بھی ہے اور نفس کا اطمینان بھی، اور اجزائے قالب کا اعتدال بھی ہے جو طغیان و سرکشی سے باز آگئے ہیں۔ پہلے درجے گویا اس متابعت کے اجزا تھے او ریہ درجہ ان اجزا کے کل کی مانند ہے۔ اس مقام میں پہنچ کر تابع کو اپنے متبوع کے ساتھ اس قسم کی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا تبعیت و پیروی کا نام ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔

من تو شدم تو من شدی

اور تابع و متبوع (کے احکام) کی تمیز دور ہو جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تابع اپنے متبوع کی طرح جو کچھ حاصل کرتا ہے اصل سے حاصل کرتا ہے، (اللہ ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین) گویا دونوں ایک ہی چشمے سے پانی پیتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے ہم آغوش و ہمکنار ہیں اور ایک ہی بستر پر شیر و شکر کی طرح ہیں، معلوم نہیں ہوتا کہ تابع کون ہے اور متبوع کون، اور تبعیت کس کے لیے ہے، اتحادِ نسبت میں تغایرِ نسبت کی کچھ گنجائش نہیں۔

عجب معاملہ ہے کہ اس مقام میں جہاں تک غور کی نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے تبعیت کی نسبت کچھ ملحوظ و منظور نہیں ہوتا اور تابعیت و متبوعیت کا امتیاز ہر گز مشہود نہیں ہوتا البتہ اس قدر

فرق معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنے نبی علیہ وعلیٰ جمیع الانبیاء من الصلوات افضلھا ومن التسلیمات اکملھا کا طفیلی اور وارث جانتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تابع اور ہوتا ہے اور طفیلی و وارث اور۔

تشریح۔ مطلب دیکھیں کہ ایک شخص کا مزاج ہی وہی بن جائے جو اپنے متبوع کا ہے، تو وہ تو وہی کرے گا جو اس کا متبوع کرتا ہے۔ تو ابھی تک تو اپنے متبوع سے لے رہا تھا، ابھی وہاں سے لے رہا ہے جہاں سے متبوع بھی لے رہا ہے، کیونکہ مزاج وہی ہو گیا۔ تو لہٰذا نتیجے میں فرق نہیں آتا، مقام میں فرق آ جاتا ہے۔

متن۔ اگرچہ تبعیت کی قطار میں سب برابر ہیں لیکن تابع میں بظاہر متبوع کا حیلولہ (حائل ہونا) درکار ہے اور طفیلی و وارث میں (متبوع کا) کوئی حیلولہ درکار نہیں ہے۔ تابع (اپنے متبوع کا) پس خوردہ کھانا کھاتا ہے اور طفیلی ضمنی طور پر ساتھ بیٹھ کر کھانے والا ہے غرضیکہ جو دولت بھی آئی ہے وہ انبیاء علیہم الصلوات والتحیات کے لیے آئی ہے اور امتیوں کے لیے یہی سعادت ہے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے طفیل اس دولت سے حصہ پائیں اور ان کا پس خوردہ تناول کریں۔

کامل تابعدار وہ شخص ہے جو متابعت کے ان ساتوں درجوں سے آراستہ ہو اور جو شخص بعض درجات میں تو متابعت رکھتا ہو اور بعض میں نہ رکھتا ہو، وہ درجات کے فرق کے اعتبار سے مجمل طور پر تابع ہے۔ علمائے ظاہر پہلے درجے ہی میں خوش ہیں۔ کاش کہ یہ لوگ درجۂ اول ہی کو سرانجام دے لیتے۔ انہوں نے صرف شریعت کی صورت ہی میں متابعت کو موقوف رکھا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور امر خیال ہی نہیں کرتے۔ اور طریقۂ صوفیہ کو جو کہ درجاتِ متابعت کے حاصل ہونے کا واسطہ ہے بیکار تصور کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر علماء، ہدایہ اور بزدوی کے

سوا کسی اور کو اپنا پیر و مقتدا نہیں جانتے۔

تشریح۔ میرے ساتھ یہ ہوا ہے، یعنی حضرت نے تو کتاب میں لکھا ہے، میرے ساتھ Practically ہوا ہے۔ ہم گئے تھے شاہپور، شانگلہ میں ایک مدرسہ ہے۔ شانگلہ میں مَیں نے جمعے کا بیان کیا۔ تو اس کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا کہ ان شاء اللہ تین بجے خواتین کے لیے بیان ہو گا۔ بیان وہاں ایک پیر صاحب تھے اُن کے گھر میں تھا۔ ہم وہاں گئے، کھانا بھی اُدھر ہی کھایا۔ تین بجے بیان تھا۔ اس مختصر سی جگہ میں تقریباً ڈیڑھ سو کے لگ بھگ خواتین جمع ہو گئیں۔ پھر الحمدللہ بیان ہو گیا۔ اس میں خواتین بیعت بھی ہو گئیں، انہوں نے ذکر بھی لے لیا۔ وہ پیر صاحب بھی بیعت ہوئے، تبلیغی جماعت کے امیر صاحب بھی بیعت ہوئے، وہ جو خطیب صاحب تھے وہ بھی بیعت ہوئے۔ مطلب تین کا Circle پورا ہو گیا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے کہا کہ پرشٹ نامی ایک گاؤں ہے قریب، وہاں جاتے ہیں۔ تو وہاں گئے۔ تو وہاں الحمدللہ جامعہ فاروقیہ کراچی کے فارغ التحصیل عالم تھے، وہ بھی بیعت ہوئے۔ اب سب نے مشورہ کیا کہ ان کو شاہپور کے مدرسے میں لے جانا ہے۔ تبلیغی جماعت کے امیر اور وہ خطیب صاحب اس کے حق میں نہیں تھے، کیونکہ وہ مدرسہ بڑے سخت لوگوں کا تھا، جو کسی چیز کو نہیں مانتے۔ یہ دونوں کہتے تھے کہ کہیں کوئی فتنہ نہ ہو جائے، کوئی لڑائی نہ ہو جائے، کوئی مسئلہ نہ ہو جائے تو وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن جو مجھے لے جانا چاہتے تھے وہ میرے میزبان تھے۔ کہہ رہے تھے، ان کو ضرور جانا ہے۔ میں نے کہا، بھئی آپ لوگ آپس میں فیصلہ طے کر لیں میں کچھ نہیں کہتا۔ جو فیصلہ آپ نے کر لیا، بس وہ مجھے منظور ہے۔ خیر اخیر میں وہ غالب آ گیا۔ لیکن اللہ کی شان کہ اس وقت گاڑی نہیں ملی۔ لہٰذا ہم شام کو تو نہیں جا سکے، اگلے دن فجر کے بعد چلے گئے۔ اس وقت جو مہتمم صاحب تھے وہ کُنڑ سے ایک جنازے میں شرکت کر کے واپس تشریف لائے تھے۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ مجھے جو لوگ ساتھ لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس نے بیان کرنا ہے۔ ان کی آپس میں بڑی بے تکلفی تھی۔ تو مہتمم صاحب نے کہا کہ سب کو جمع کر لو۔ تو ایک ہال میں سب کو جمع کر دیا اور بے تکلف یہ اعلان کر دیا کہ میں ان کو نہیں جانتا لیکن ان لوگوں نے کہا ہے کہ یہ بیان کریں گے۔ اس طرح بہت سادگی کے ساتھ بات کر لی۔ مجھے بہت پسند آئی اُن کی بات۔ خیر بہرحال

یہ کہ بیان میں نے کر لیا۔ بیان کے بعد ایسا ہوا کہ مجھے دو تین لڑکوں نے پہچان لیا کہ فہم الفلکیات کا مصنف ہے۔ تو وہ میرے پیچھے آئے کہ آپ ہمیں کچھ درس دے دیں تا کہ ہم آپ کی شاگردی میں آ جائیں۔ میں نے کہا کہ میں استادوں کو پڑھاتا ہوں لیکن کسی مدرسے میں شاگردوں کو نہیں پڑھاتا اس میں مسائل ہوتے ہیں۔ تو جو مہتمم صاحب تھے انہوں نے کہا، کیوں نہیں پڑھاتے؟ میں نے کہا مسئلہ ہو جاتا ہے، پھر استادوں کا وہ مقام نہیں رہتا۔ اُنہوں نے کہا کہ نہیں اگر لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے تو پڑھانا چاہیے۔ میں نے کہا چلو پھر ٹھیک ہے، میں پڑھا دیتا ہوں۔ تو خیر میں نے کچھ ایک دو صفحے پڑھا دیئے۔ اس کے بعد کچھ حضرات آئے اور کہا جی ہم بیعت ہونا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو اور بھی زیادہ خطرناک بات ہے۔ مہتمم صاحب نے کہا کیوں؟ میں نے کہا، میں مدرسے میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا اور یہ مدرسہ ہے۔ تو اُنہوں نے کہا نہیں جی آپ بیعت کر لیں چونکہ ان کو فائدہ ہے تو آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟ میں نے کہا، آپ کی اجازت ہے؟ کہتے ہیں، ہاں۔ میں نے کہا، اچھا بھئی آ جاؤ جو بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ساٹھ ستر کے قریب لوگ آ گئے اور اجتماعی بیعت ہو گئی۔

یہ تو پہلے سال کا واقعہ ہے۔ اگلے سال انہوں نے خود بُلایا کہ آپ نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی آپ اگر ایک ہفتے کے لیے آ جاتے تو یہاں پورا علاقہ ہمارا ہے۔اس میں بہت کام ہو سکتا ہے، اور آپ کے تصوف کو ہم مانتے ہیں کہ صحیح ہے اور یہ قرآن و سنت کا تصوف ہے، اس کو تو ہم بھی مانتے ہیں۔ تو آپ ضرور تشریف لائیں۔ تو پھر اگلی دفعہ میں خود گیا۔ اگلی دفعہ گیا تو وہاں جو سخت لوگ تھے ان لوگوں نے کوئی سازش بھی کر لی تھی۔ وہ جو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ اس طرح ہوا ہے تو وہ یہ بات ہے۔ تو سازش اس طرح کی کہ ان میں سے جو سٹیج سیکرٹری تھے، اس نے کہا کہ ہم قرآن پاک کی تلاوت کے لیے فلاں قاری صاحب کو بلاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کہا، جی وہ نہیں ہیں، چلو جی پھر آپ آ جائیں۔ ایک اور آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ جب اٹھے تو اس کے منہ پر ایک شرارتی قسم کی مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا کہ کام تو ہو گیا، چکر چل پڑا۔ اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے سنی ان سنی کر لی کہ جو چاہو کرو، میں نے کچھ نہیں کہنا فی الحال، کیونکہ میں نے اپنے پروگرام کو تو خراب نہیں کرنا۔ تو انہوں نے جو تلاوت کی، تلاوت میں یہ تھا کہ جو تم قرآن سے اغراض کرنے والے تھے، اب کیوں بھاگتے ہو۔ کچھ

اس طرح کی قرآن پاک کی آیت کریمہ پڑھیں۔ پھر کہا کہ بھئی پیر اصل میں قرآن ہے، کوئی اور پیر نہیں ہوتا۔ صاف اس طرح بات کی کہ پیر اصل میں قرآن ہے۔ قرآن کی آیت سے استدلال کیا ، اس کے علاوہ کوئی اور پیر نہیں ہوتا۔

اب میں نے ایسے سُنی اَن سُنی کر دی، جیسے میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ اور میں نے اپنا پورا بیان کر دیا، ایک گھنٹے کا بیان کرنے کے بعد آخری پانچ منٹ اس بات کو دیئے۔ میں نے کہا، اچھا بعض ساتھیوں نے یہ بات کی ہے تو ذرا سن لیں۔ میں نے کہا، علی کرم اللہ وجہہٗ کی جب خوارج کے ساتھ لڑائی تھی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھیجا، پھر خود بھی تشریف لے گئے۔ تو مصحف کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور فرمایا، یامصحف کلم الناس۔ یامصحف لوگوں کے ساتھ بات کر۔ تو انہوں نے کہا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ تو علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم کہلوانا چاہتے ہو۔ تم کہتے ہو قرآن ہی ہمارے لیے کافی ہے، تم قرآنِ ناطق کو نہیں مانتے، قرآنِ ساکت کو مانتے ہو، تو پھر کرے تمہارے ساتھ بات۔ تو میں نے کہا، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے استدلال کیا کہ قرآن کو سمجھانے والا ساتھ ہونا چاہیے۔ تو یہ جو پیر ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ وہ عمل کرواتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں فرمایا، ، کہ " اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ " اس میں چار قسم کے لوگ ہیں اور یہ چار قسم کے لوگ سارے رجال اللہ ہیں، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، سب رجال اللہ ہیں۔ اور دوسرے سورۃ البقرہ میں، "الٓمّٓ ۚ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ"اس میں کتاب اللہ کا تعارف ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ تو فرمایا، جنہوں نے دونوں کو لے لیا، وہ بچ گئے، انہوں نے ہدایت حاصل کی۔ جنہوں نے رجال اللہ کو بھی لیا، کتاب اللہ کو بھی لیا، تو وہ کامیاب ہو گئے۔ اور جنہوں نے رجال اللہ کو لیا، کتاب اللہ کو نہیں لیا، یہ بھی گمراہ ہو گئے، فاطمین یہی تھے۔ اور جنہوں نے کتاب اللہ کو لیا، رجال اللہ کو نہیں لیا، یہ بھی گمراہ ہو گئے، خوارج یہی تھے۔ تو میں نے کہا، خوارج بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بس اس کے بعد میں نے ختم کر دیا۔

اس وقت بھی تقریباً سات یا گیارہ آدمی بیعت ہوئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہْ !

تو میں عرض کرتا ہوں کہ اصل میں یہ مسئلہ ہے کہ لوگ بعض دفعہ کہتے ہیں

بس جی یہ کافی ہے ناں، کیا قرآن کافی نہیں ہے؟ تو "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ" یہی نعرہ تھا۔ خوارج کا نعرہ کیا تھا؟ کہ کیا قرآن کافی نہیں ہے؟ ان کا نعرہ یہی تھا۔ اور وہ صرف اپنے آپ کو صحیح سمجھتے تھے، کسی اور کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کی خصوصیت یہی تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ اسی بات پر مناظرہ کیا، جس کی وجہ سے ان کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے توبہ کر لی، وہ تو حضرت کے ساتھ ہو گئے۔ دوسرے گروہ نے خاموشی اختیار کر لی اس وقت، لیکن بعد میں بات نہیں مانی۔ یعنی یہ صرف ظاہر بینوں کا کام ہے کام ہے، ورنہ حقیقت میں آگے بھی کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

مقاماتِ قطبیہ ومقالاتِ قدسیہ

بابِ اول

متن: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَعِتْرَتِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ ○

رسول کریم ﷺ پر درود، خدا کی حمد کے بعد عبد الحلیم جو کہ خدا تعالیٰ کے ولی وسیلے کی تلاش میں ہے۔

تشریح۔ وسیلہ کیا ہے ؟ وسیلہ مقامِ قرب کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کچھ حاصل کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے کسی وسیلے کی تلاش میں ہوں۔

متن: عرض کرتا ہے کہ میں گنہگار اور بدامن ہوں مگر اس کے باوجود خداوند رحیم اور کریم کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میرے گناہوں کو معاف فرما دیں گے اور میری عبادت اور طاعت کو میری شرمندگی اور عذاب کا سبب نہیں بنائیں گے بلکہ مجھے بہشتِ بریں میں داخل فرمائیں گے اور حشر نشر کے دن مجھے شرمندہ نہیں کریں گے اور میرے ساتھ سخت حساب نہیں فرمائیں گے اور دوزخ کے عذاب سے مجھے پناہ دیں گے اور مجھے عارف اور محبت کرنے والوں کی محبت نصیب فرمائیں گے۔

وارزقنی شفاعۃ النبی الکریم یا مولانا یا مولانا یا سامع دعانا فی یوم الحشر والنشر واغفرلی وابوینا وادخلنی الجنۃ واجرنی من النار بحرمتہ ولا تقطع رجانا۔

(ترجمہ) اے ہمارے مولا اے ہمارے مولا اے ہماری دعاؤں کے سننے والے حشر نشر کے دن نبی کریم ﷺ کی شفاعت مجھے نصیب فرما، میری

اور میرے والدین کی مغفرت فرما، مجھے جنت میں داخل فرما اور رسولِ کریم ﷺ کی حرمت کے طفیل مجھے دوزخ سے دور فرما، اور ہماری اُمیدیں قطع نہ فرما۔ چونکہ میرے دل و دماغ میں حضرت صاحب (شیخ رحمکار رحمۃ اللہ علیہ) کی مدح اور تعریفیں کثرت سے آتی تھیں اور میری یہ سخت خواہش تھی کہ اپنے شیخ محترم کے مناقب جمع کروں۔ اسی لیے چند ایک صحیح مناقب جو کہ میرے ہاتھ لگے تھے، میں نے حوالہ قرطاس و قلم کئے اور اُن کو ضبط تحریر میں لایا۔ اگرچہ میں خود کو اُن کی مدح اور تعریف کے قابل نہیں سمجھتا لیکن میں نے اپنے فائدے کے لیے بہت محنت کرکے یہ مناقب جمع کئے تاکہ دنیا اور آخرت میں میرے لئے باعث نفع و جزا ہوں۔

تشریح۔ حضرت نے عاجزی کے ساتھ اپنا ارادہ بیان کیا اور یہی ہمارے بزرگوں کی شان ہے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ ان جیسی تواضع ہمیں بھی نصیب فرمائے (آمین)

متن: حضرت صاحب کے اسماء کے بیان میں اور خود حضرت صاحب کا طریقہ اور جناب حضرت صاحب کا مریدوں کے تربیت کا بابرکت طریقہ:

جناب حضرت صاحب کے وہ نام جو کہ لوگوں میں بہت مشہور تھے، یہ ہیں۔ شیخ رحمکار، شیخ رامکار، کستری، کستر (بہ سکون را) اور بہت سے لوگ اُن کو کاکا کہتے تھے۔ اور مُغلیہ خاندان کے بعض لوگ اُن کو رحمان کار کہتے تھے۔ واللہ اعلم۔

تشریح۔ اصل میں بعض حضرات صفاتی لحاظ سے بہت مشہور ہو جاتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے ذاتی نام۔ ذاتی نام تو ہر ایک کا ایک ہی ہوتا ہے لیکن بعض حضرات کی صفات اتنی زیادہ اونچی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے صفات کے لحاظ سے بہت زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے اصل نام بعض دفعہ گم ہو جاتے ہیں۔ کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی یہی بات ہوئی۔ حضرت چونکہ بہت رحم کرتے تھے، بہت زیادہ شفیق تھے، بہت زیادہ لوگوں

کے ساتھ محبت کرتے تھے تو لوگ حضرت کو اپنے اپنے انداز میں محبت کے ناموں سے یاد کرنے لگے۔ لوگوں نے ان کو اپنے اپنے رنگ میں اپنے اپنے محبت کے انداز میں جو چاہا نام دے دیا۔ جیسے ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لوگ میاں صاحب کہتے تھے۔ اُن کا اصل نام شاید کسی کو معلوم نہ تھا۔ گاؤں کے بہت کم لوگوں کو ان کا اصل نام معلوم تھا کہ والد صاحب کا نام کیا تھا۔ان کا نام سید علی شاہ تھا۔ اور بھی لوگوں کا نام میاں صاحب تھا لیکن کوئی اگر کہتا کہ میاں صاحب کے پاس جانا ہے تو لوگ یہی سمجھتے کہ میاں صاحب (یعنی میرے والد صاحب) کے پاس آرہے ہیں۔ میاں صاحب ان کے لئے ایسا ہی بن گیا تھا جیسے ذاتی نام ہو۔ میری چھوٹی بہن تھی جو فوت ہو گئیں۔ بچپن میں اُن کی ایک دفعہ سکول میں ایک لڑکی کے ساتھ لڑائی ہوگئی۔ گاؤں میں لوگ غصے کی حالت میں والد کا نام لیتے ہیں تو وہ لڑکی بھی بولی میاں صاحب میاں صاحب۔ تو میری بہن غصے میں بولی ایسا کیوں کہتی ہو؟ حالانکہ یہ والد صاحب کا ذاتی نام تو نہیں تھا، صفاتی نام تھا اور ذاتی نام پر لوگ غصہ ہوتے ہیں کہ بڑے کا نام لیا۔اُس لڑکی کو ذاتی نام معلوم ہی نہیں تھا تو وہ بھی یہی کہہ رہی تھی میاں صاحب، میاں صاحب، میاں صاحب۔ تو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے صفاتی نام زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں۔

تو یہاں بھی عوام کے اندر جو ایک تاثر پایا جاتا ہے اسکی طرف اشارہ ہے۔ کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جو مختلف نام مشہور ہوئے ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں کہ عوام میں بہت زیادہ اثر تھا۔ عوام کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ ابھی آگے ان شاء اللہ آئے گا۔اسی میں چونکہ ناموں والی بات آگئی تھی اسلئے عرض کر دی۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خلوت نشینی بہت زیادہ غالب تھی کہ گمنام رہیں۔ ابھی بھی اُن کی جگہ دیکھ لیں جو ان کا مقامِ پیدائش ہے وہ ایسا ویران ہے کہ کوئی اُس طرف جاتا بھی نہیں۔ وہ درخت اب بھی موجود ہے جس کے ساتھ پنگوڑہ بندھا ہوتا تھا۔ حضرت بالکل لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہتے تھے اور لوگ دور دور سے جوق در جوق آتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو روکنے کے لئے اپنے علاقے کے قریب لوگوں کو کہا کہ ان کو کھانا نہ دیں تاکہ لوگ نہ آئیں۔ ان لوگوں نے کھانا بند کر دیا۔ ظاہر ہے کاکاصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات

مانتے تھے۔ تو لوگ اپنے ساتھ کھانا لانا شروع ہو گئے اور ان لوگوں سے کھانے کا سامان خریدتے تھے۔حضرت کو جب پتہ چلا تو کہا کہ ان کو یہ چیزیں بھی نہ دو۔ لوگوں نے وہ بھی بند کر دیا۔ پھر لوگ اپنے ساتھ پکانے کی ساری چیزیں لاتے تھے اور کھانے پکانے کا باقاعدہ انتظام کر لیا۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ میں تو چاہتا تھا کہ لوگوں کے سامنے نہ آؤں لیکن اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ پھر حضرت نے خود ہی ان لوگوں کے لئے لنگر کا انتظام فرما دیا اور وہ لنگر ابھی تک چل رہا ہے۔ ایسا ہوتا ہے ایسے لوگ جو محبوبُ الخلائق ہوں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کا الگ ہی نظام ہوتا ہے۔

متن:

اوصاف حمیدہ کی پہلی قسم

شیخ رحمکار رحمۃ اللہ علیہ کے اوصافِ حمیدہ

وہ بہت دیندار تھے صاحبِ قُرب تھے اور بساطِ قُرب پر متمکن تھے، اُن میں کبر و غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ قلبِ سلیم کے مالک تھے اور اُس قلبِ سلیم میں کسی قسم کے غیر اللہ کی کدورت نہیں رکھتے تھے۔ غیرِ حق سے نگاہِ آشنا نہ تھی۔ معرفت کی محبت اپنے سینے میں کمال درجہ رکھتے تھے۔ غیر حق پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ ظاہر میں کتابِ خوان اور باطن میں تقویٰ سے آراستہ عقبیٰ کو مد نظر رکھتے، راہ عشق کے سرگرم راہرو اور شہسوارِ عشق و محبت تھے، وہ صاحبِ جذب و کشش تھے، مراتبِ عالی کے مالک تھے ،اپنی ہستی کی نفی کرتے، اور رات کے وقت غیر حق کو چھوڑ کر سیر مع اللہ میں مشغول ہوتے۔درمیان سے غیریت برطرف تھی۔ محقق اور سراپا محبت تھے۔ شریعت میں کمال کا درجہ حاصل تھا، طریقت و حقیقت میں تام تھے، اور شوق و اشتیاق میں ہر وقت روبہ ترقی تھے، آپ کا دل توکل سے مملوتھا، دل میں مجذوبوں کی طرح سوز اور جذبہ رکھتے تھے، تقرب کے میدان میں گویا سبقت لے

چکے تھے۔ اپنے زمانے میں باادب مقتدا اور پیشوا تھے۔خود بھی کامل تھے، اور دوسروں کو بھی کامل بنانے کاسلیقہ رکھتے تھے۔ محبتِ الٰہی کی شراب سے سرشار تھے، علم لُدنی کے عالم اور راہِ حقیقت کے شناسا تھے، خدا کی مخلوق اُن کی ملاقات سے دانۂ اسپند کی طرح سوزش میں آتے، کشفُ القلوب کے حامل تھے، اپنے نفس کے عارف تھے، اور موت سے قبل اشنائے موت ہو گئے تھے۔فقط اپنے مطلوب پر نظر جمائے رکھتے تھے، اُن میں انانیت بالکل نہ تھی، اُن کی بقاء حق پر تھی، یعنی باقی باللہ تھے، حقیقی ایمان رکھتے تھے، اور بغیر کسی پردے اور حجاب کے حق الیقین رکھتے تھے، اور حق الیقین رکھنے کی وجہ سے سوال و جواب کے محتاج نہ تھے۔ اور کسی قسم کی لاف زنی نہیں کرتے تھے۔

تشریح۔ یہ تھوڑی سی تفصیل طلب ہے۔اقوال، اعمال اور احوال یہ تین چیزیں ہیں۔ کچھ لوگ جو صاحبِ قال ہوتے ہیں، صاحبِ اعمال نہیں ہوتے یعنی باتیں بہت اونچی کرتے ہیں لیکن اعمال صفر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صاحبِ قال کہتے ہیں۔ یہ صاحبِ قال ہیں صاحبِ اعمال نہیں ہیں۔ کچھ لوگ صاحبِ اعمال ہوتے ہیں لیکن صاحبِ احوال نہیں ہوتے۔ اُن کے اعمال میں جان نہیں ہوتی مثلاً وہ بہت عمل کرتے ہیں نمازیں بہت پڑھتے ہیں، روزے بہت رکھتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں، حج کرتے ہیں لیکن اُن کے اندر وہ لِلّٰہیت نہیں ہوتی جو ہونی چاہیئے۔ یہ لِلّٰہیت سارے اعمال کی جان ہے اور اعمال کی روح ہے۔ تو ایسے شخص کے اندر اپنی ذات کی طلب زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی عمل کرتے ہیں تو اُن کی اپنی ذات آگے آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا۔ یعنی جب کوئی عمل کرتے ہیں تو اُن کی نگاہ اپنی ذات پر چلی جاتی ہے۔ عمل اللہ کے لئے ہوتا ہے لیکن نگاہ فرد پر جاتی ہے۔ اگر عمل اللہ کے لئے نہیں ہے پھر تو ریا ہو گیا۔ اگر عمل اللہ کے لئے ہے اور نگاہ اپنے اوپر جائے تو اِسے کہتے ہیں حجابِ نفس۔ یعنی اپنی نگاہوں میں خود بڑا ہونا۔اس سے آپ ﷺ نے پناہ مانگی ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ اضطراری طور پر اس طرف

آئے لیکن اُمت کی تعلیم کے لئے فرمایا۔" اللّٰھمَّ اجْعَلنی فی عَیْنی صَغیرًا و فی أعْیُنِ النَّاسِ کَبیرًا "اے اللہ مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا کر دے اور دوسروں کی نگاہوں میں بڑا کر دے۔ ہم نے اپنے شیخ سے پوچھا کہ حضرت یہ کیسی دعا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا کردے یہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن دوسروں کی نگاہوں میں بڑا کر دے یہ کیامانگ رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص یہ نہ مانگے اور دوسروں کی نگاہوں میں چھوٹا ہو جائے تو ان کے لئے عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ ان کے کاموں میں مُخل ہوتے ہیں ان کو کام نہیں کرنے دیتے۔ یہ بھی بڑا فضل ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں تو بڑا ہوتا ہے لیکن اپنی نگاہوں میں چھوٹا ہے۔ لوگ ان کو بڑا ولی اللہ سمجھتے ہیں اوروہ خود اپنے آپ کو گناہگار سمجھتے ہیں۔ یہی اللہ والوں کی شان ہے جیسے مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ اپنے بارے میں کیا فرماتے تھے؟ خاکسار، ریاکار، سیاہ کاراور پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا کیا کہتے تھے۔ لیکن لوگ اُن کو کیا سمجھتے تھے؟ لوگ تو ان کو بہت بڑا ولی اللہ سمجھتے تھے۔ یہی چیز بزرگوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو صاحبِ قال کو صرف باتیں کرنا آتی ہیں، صاحبِ اعمال کو اعمال حاصل ہوتے ہیں لیکن اُن اعمال میں اُس کی نظر اپنے آپ پر جاتی ہےاور صاحبِ حال وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے اعمال میں جان ہوتی ہے۔ یعنی ان کی نمازوں کے اندر خشوع، للّٰہیت اور عاجزی ہوتی ہے۔ اعمال کی وجہ سے اُن نظر اپنے آپ پر نہیں جاتی بلکہ وہ اُن اعمال کو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتا ہے جسکی وجہ سے ان کے عمل کی حیثیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ چیز کیسے حاصل ہو اس کے بارے میں حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

قال را بگزار مرد حال شو
پیش مردِ کاملے پامال شو

قال کو چھوڑ دو صاحبِ حال بن جاؤ اور اس کے لئے کسی مردِ کامل کے سامنے اپنے آپ کو پامال کردو۔ آج کے نام نہاد مردِحال نے عمل کو درمیان میں چھوڑ دیا۔ حالانکہ مرد ِحال میں عمل بذاتِ خود شامل ہے۔ کیونکہ برتن نہ ہو تو برتن کے اندر جو چیز ہے وہ کیسی ہوگی ؟ میں اگر کسی کو کہتا ہوں کہ دودھ لاؤ تو اس میں یہ بات بذاتِ خود موجود ہے کہ برتن میں دودھ لاؤ۔ دود ھ لاؤ یہ بامعنی لفظ ہے۔ دودھ لاؤ میں یہ شامل ہے کہ دودھ برتن

میں میرے پاس لاؤ، تبھی تو دودھ لایا جا سکتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ دودھ والے برتن میں دودھ لاؤ کیونکہ چیز خود بخود لوگوں کو سمجھ آجاتی ہے کہ بغیر برتن کے دودھ نہیں لایا جا سکتا۔ لہٰذا اسکے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے جو فرمایا

قال را بگزار مرد حال شو
پیش مردِ کاملے پامال شو

اس میں حال خود بخود موجود نہیں ہوتا جب تک عمل موجود نہ ہو۔ عمل کے بغیر حال کی مثال ایسی ہے جیسے دھواں، شور شرابا اور کچھ بھی نہیں اور عمل کے ساتھ حال کی مثال ایسی ہے جیسے انجن۔ انجن موجود ہو اور اس میں طاقت ہو تو شی شی تو وہ بھی کرتا ہے لیکن اسکے ساتھ وہ طاقت ہوتی ہے جو گاڑی کو چلا سکتی ہے۔ یہ جو چیز ہے مثال کے طور پر انجن کے اندر Piston کے اردگرد کوئی leakage نہیں ہے تو جتنا پریشر بنتا ہے وہ Piston کو دھکیلنے میں استعمال ہوتا ہے نتیجے میں انجن چلتا ہے لیکن کہیں سے اگر leakage موجود ہو تو کیا پھر بھی Piston چلے گا؟ بس شی شی تو ہو گی لیکن Piston نہیں چلے گا، گاڑی نہیں چلے گی۔ پھر مکینک کے پاس جاتے ہیں۔ مکینک کہتا ہے اوہو فلاں چیز ٹھیک نہیں ہے۔

اس طریقے سے یہ جو بات ہوتی ہے، جو عمل حال کے ساتھ نہ ہو تو اس کے اندر وہ چیز ہی موجود نہیں ہے۔ یعنی Piston تو موجود ہے پاور موجود نہیں۔ صرف پاور موجود ہو Piston موجود نہ ہو تو صرف شی شی موجود ہے لیکن گاڑی میں حرکت نہیں ہے۔ لیکن جب دونوں کو جمع کر دیں گے تو ایک سسٹم بن جائیگا اور ماشاء اللہ گاڑی چلے گی۔

اس طریقے سے اعمال بھی ہوں اور ساتھ حال بھی ہو تو یہی اصل میں بنیادی چیز ہے۔ اسی کو حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے دو الفاظ میں بیان کیا ہے۔ شریعت پر دل سے چلنے کا نام حقیقت ہے اور اس حقیقت کو طریقت کے ذریعوں کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی شریعت پر دل سے عمل کرنے کا نام حقیقت ہے اور اس کو حاصل کرنے کا نام طریقت ہے۔ طریقت وہ ذرائع ہیں جس کے ذریعے سے وہ سب کچھ حاصل کیا جاتا ہے جو حقیقت میں ہے۔ یعنی نماز کی حقیقت جس کو حقیقت صلوٰۃ کہتے ہیں۔ حقیقتِ صلوٰۃ کیا ہے۔ "اِنَّ

الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ ○"

بے شک نماز بے حیائی اور گمراہی سے روکنے والی ہے اور اللہ کی یاد تو بڑی چیز ہے۔ اس کے اندر اس کی حقیقت پنہاں ہے۔ جتنی نماز کے اندر اللہ کی یاد ہوگی اتنی نماز قوی ہوگی۔ یعنی" وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ ○" "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ" ان آیات کو ساتھ پڑھ لو تو بات مزید سمجھ میں آئے گی۔ نماز قائم کرو میری یاد کے لئے۔ اب جس نماز کے اندر اللہ کی یاد نہیں ہوگی وہ نماز تو رہے گی لیکن اس کے اندر قوت نہیں رہے گی۔ الفاظ کی ادائیگی تو ہوتی ہے یعنی میں الفاظ تو پڑھ لوں لیکن جو کنکشن ان الفاظ کا اُس ذات کے ساتھ ہے وہ نہ ہو تو Piston موجود تو ہے لیکن Leakage والا ہے لہٰذا وہ چیز نہیں ہے۔ چنانچہ جب نماز کے ذریعے سے آپ کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو جائے تو پھر چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہوجائے لیکن آپ کی نماز میں اورتوجہ الی اللہ میں فرق نہیں آئے گا۔اب یہ وہ نماز ہے جس سے اللہ تعالیٰ تک آپ کی رسائی ہوگی۔ پھر آپ کی نماز نماز ہوگی۔ پھر اس نماز کے ذریعے سے آپ اللہ سے مانگ سکتے ہیں۔"وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ" پھر یہی نماز "اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ" ہو جائے گی یعنی نماز بے حیائی سے روکنے والی ہو جائے گی۔ لیکن اگر نیت کچھ اور ہو تو چیز کسی اور طرف چلی جائے گی۔ پھر یہ ساری بات نہیں ملے گی۔ پھر نماز کی حقیقت نہیں ہو گی۔ نماز کی اسی حقیقت کو لانے کے لئے طریقت ہے۔ طریقت اسی مقصد کے لئے ہے۔ اب لوگ کہتے ہیں کہ صرف الفاظ کے ذریعے سے حاصل ہو جائے تو یہ صرف الفاظ کے ذریعے سے تو حاصل نہیں ہوتی اس کو حاصل کرنے کے لئے طریقت ہے۔ جہاں جہاں سےLeakageہو اس کو بند کرنا پڑتا ہے۔ راستوں کو بند کرنا پڑتا ہے، مرمت کرنی پڑتی ہے۔ سب چیزیں کرنی پڑتی ہے پھر اسکے بعد اصل چیز سامنے آتی ہے۔

عموماً لوگ سطحی طور پر سوچتے ہیں ان کو بات سمجھ نہیں آتی، سطحی طور پر سوچتے ہیں کہ ہم نماز تو پڑھتے ہیں تو کیا یہ کافی نہیں ہے؟ ہم کہتے ہیں پڑھنا تو چاہئے اس سے تو ہم آپ کو نہیں روکتے یہ تو اللہ کا حکم ہے۔ "وَاَقِیۡمُ الصَّلٰوۃَ" اللہ کا حکم ہے اور دن میں پانچ بار کا حکم ہے۔ لیکن اس کو کامل بنانے کا بھی تو حکم ہے ،اس کو صحیح کرنے کا بھی حکم

ہے۔ اگر وہ چیز جو آپ صحیح کر نہ سکیں پھر اسکا فائدہ نہیں ہو گا وہ چیزیں جو اسکے ساتھ لگی ہوئی ہیں اور آپ کو نہیں ملیں تو اسکا مطلب ہے کہ وہ چیزیں Missing ہیں۔ اب accelerator کو تو خوب دبائیں لیکن گاڑی اپنی جگہ کھڑی رہے تو آپ کیا کریں گے؟ انجن میں leakage ہے، یا پٹرول گر رہا ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے جس کی وجہ سے گاڑی نہیں چل رہی۔ مسئلہ کہاں ہے؟ یہی چیز آپ کو مکینک بتائے گا۔ یہی مثال ہے کہ وہ جو مکینک آپ اس مقام پر لائیں گے جو کہ آپ کو یہ بتائے کہ کہاں مسئلہ ہے جس کی وجہ سے آپ کی نماز میں وہ للّٰہیت نہیں ہے جو کہ ہونی چاہئے تو وہ عارف باللہ ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مقامِ طریقت سے آشنا کیا ہو گا وہی یہ دیکھے گا کہ کہاں مسئلہ ہے وہ آپ کو بتائے گا اور اُس کا حل بھی آپ کو بتا دے گا۔

متن: وہ شریعت کا بحرِ بے کراں تھے۔ اور شریعت کے مطابق اخلاق رکھتے تھے، قول کے سچے اور جھوٹ و فریب کے راستے سے کوسوں دور تھے، طریقت کے سمندر تھے، مگر اُن میں فخر و غرور کا شائبہ تک نہ تھا، زُہد و ریاضت میں یکتائے روزگار تھے، حقیقت کے سمندر تھے، اور سر کی آنکھوں سے اُسے دیکھتے تھے، سیر میں تازہ دم رہتے تھے، کوئی دوسرا شخص درمیان میں حائل نہ تھا، معرفت کے سمندر تھے، غیر اللہ کا خوف اُن کے دل میں نہ تھا، اور دوست کے مشاہدے اور ملاقات میں تمام کرب و بلا سے بے نیاز تھے۔

تشریح۔ تھوڑا سا آپ اندازہ کریں کہتے ہیں کہ جن کا آخر اچھا ہو اس کا سب کچھ اچھا۔ تو دیکھو اب حضرت کا آخر کیا تھا؟ جمعہ کا دن تھا حضرت بیمار تھے اور باوجود بیماری کے نماز کے لئے مسجد پہنچے۔ خطبہ جمعہ شروع ہے خطبہ میں یہ حدیث شریف آجاتی ہے اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست کے ساتھ ملاتا ہے ،اسی وقت حضرت نے جان دے دی۔ اب جس کے لئے اللہ تعالیٰ ایسا وقت چُن لے جمعہ کا دن، خطبہ کا وقت اور اس کیفیت کے ساتھ " اَلْمَوْتُ جَسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ" موت دوست کو دوست کے ساتھ ملاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی روح

جسم سے پرواز کر جاتی ہے۔ اب اندازہ کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا کیسا مقام ہو گا؟

متن: آگے مزید فرماتے ہیں حضرت کے بارے میں کہ دوست کے مشاہدے اور ملاقات میں تمام کرب و بلا سے بے نیاز تھے، اپنے زمانے میں دین کو زندہ کرنے والے بایزید رحمۃ اللہ علیہ، بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح نہایت سخی اور صاحب جود تھے اور جود و سخا کے ایک اتھاہ سمندر تھے، صاحبِ دل تھے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے خُلقِ عظیم رکھتے تھے، عالمِ غیب یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُنہیں نیک کاموں کا الہام ہوتا تھا، تین سال میں تیس ہزار غلاموں کو آزاد کیا، جس کا اُنہیں الہام ہوا تھا، قربہ اور اچھی قسم کی بے شمار گائیں اور ہزاروں دُنبے خیرات کئے۔ محتاجوں کو بے شمار نقد رقم دی، بہت سارے گھوڑے ذبح کئے۔ بے نوا ،بے سہارا، نادار، فقیروں کو بہت سا لباس دیا۔ ہر کام خدا کے لئے کرتے تھے۔ اچھے طریقے سے پکایا ہوا طعام عام و خاص لوگوں کو کھلاتے تھے، جو کوئی کھانا چاہتا تھا بلا تکلف سیر ہو کر کھاتا تھا، گھی پانی کی طرح بے حساب فراواں طور پر خرچ ہوتا تھا، نہایت متحمل مزاج اور بردبار تھے، ہر وقت باوضو رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔

تشریح۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ یہ سمجھانا ذرا مشکل ہے لیکن بہرحال میں سمجھانے کے لئے عرض کر دیتا ہوں۔ مجھے اللہ دیتا ہے۔ یہ دل کھڑکی ہے اس کے ذریعے سے میں لیتا ہوں۔ ایسا ہے نہیں لیکن میں سمجھانے کے لئے مثال دے رہا ہوں۔ دل ایک کھڑکی ہے اور اللہ دیتا ہے اور دوسری کھڑکی میں لوگ کھڑے ہیں اللہ سے لے کر میں ان کو دیتا ہوں۔ مجھے بتاؤ جو مالدار ہوتے ہیں اُن کو کس نے دیا؟ اللہ نے دیا۔ پھر وہ غریبوں کو کیوں نہیں دیتے؟ جس کو یہ ربط ہی سمجھ نہیں آرہا کہ اللہ دیتا ہے وہ آگے کیسے چلے گا؟ جس کو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اللہ دیتا ہے وہ آگے کیا دے گا وہ آگے

کیا چلے گا ؟تو اُسی جگہ لاک لگ جاتا ہے۔ اگر وہ چلے گا تو یہی لاک کھولا جائیگا کہ اللہ دیتا ہے۔ معرفت اس کو کہتے ہیں کہ اسکو پتہ ہے کہ اُدھر سے اللہ دے رہا ہے اور کس کے لئے دے رہا ہے؟ جسکے لئے دے رہا ہے اُن تک پہنچادے۔ اگر ایسا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی ان کو بے حساب دیتا ہے اور وہ بے حساب لوگوں کو دیتے ہیں لیکن یہ اُس وقت دیتا ہے کہ جتنا آپ کے پاس ہے اسکا حساب آپ نہ کریں اور آگے غریبوں میں تقسیم کریں پھر وہاں سے بھی بے حساب آتا ہے۔ اگر آپ نے اپنا حساب ساتھ رکھ لیا تو اُدھر بھی حساب رکھنے والا موجود ہے۔ جو صاحب معرفت ہوتا ہے وہ ان چیزوں کو جانتا ہے۔

تو حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ دیتے تھے اس میں کوئی شک نہیں اور صرف کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نہیں آپ تکوینی بزرگوں کو دیکھیں اُن میں سے اکثر کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مزدوری کرتے تھے اور اللہ ان کو اتنا دیتا تھا کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی ڈیوٹیاں لگائی ہوئی تھیں غریبوں، بیواؤں، یتیموں کے لئے اُنہوں نے وظیفے مقرر کیے ہوئے تھے اور حضرت اپنا نام سامنے نہیں آنے دیتے تھے اپنے شاگردوں کو کہتے کہ فلاں کو آپ دیں فلاں کو آپ دیں۔لوگ سمجھتے تھے کہ یہ طالب علم دے رہے ہیں تو اُن کی قدر کرتے کہ وہ دے رہے ہیں۔ پیچھے سے کون دیتے تھے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دیتے تھے۔ اسکا پتہ اُس وقت چلا جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے تو سب وظیفے بند ہوگئے۔ پھر لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دیتے تھے۔یہی چیز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی تھی، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ہے کہ ایک دفعہ کسی نے حضرت کو تیس ہزار اشرفیاں ہدیہ دے دیں اور گھر پہنچنے سے پہلے پہلے سب خیرات ہو گئیں۔اب کر لو حساب ذرا۔ ان کے دل اتنے بڑے تھے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ دیکھو اللہ نے ان کو اتنا دلوایا لیکن ساتھ دل اتنا بڑا دیا کہ اس پر ان کا دل نہیں آیاان چیزوں سے بڑے کی طرف نظر رکھی۔ لہٰذا ان چیزوں کو اپنے ساتھ رہنے نہیں دیا اُن کو دل میں بڑا نہیں ہونے دیا۔

تو کاکاصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی بات تھی اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے حساب دیا۔حضرت کاکا

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی کی مزدوری تو نہیں کرتے تھے اور کسی نے حضرت کو مزدوری کرتے نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو دیتے تھے۔ دیتے تو اللہ ہیں لیکن ظاہری اسباب اس کے یہ ہوتے کہ لوگ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیتے تھے۔ لوگ کیوں دیتے تھے؟ یہ ایک فضول سوال ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک فضول سوال ہے کہ وہ لوگوں کو کیوں دیتے تھے؟ یہ سوال بھی فضول ہے۔ جو جاننے والے ہوتے ہیں وہ جان لیتے ہیں جو اعتراض کرنے والے ہوتے ہیں وہ اعتراض کرتے ہیں۔ جو لوگ ان فضول باتوں میں پڑ جاتے ہیں وہ اپنا وقت فضول میں ضائع کرتے ہیں اور جو اس طریقے سے حقیقت کو پا لیتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو بھی چُن لیتے ہیں اصل بات یہی ہے۔ ایسے لوگوں پر اللہ پاک کا کرم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی نظر ان چیزوں پر نہیں ہوتی۔ بس یہی طریقت کا اثر ہوتا ہے۔ کہ اِن چیزوں پر نظر نہ رہے۔ ان چیزوں سے نظر اُٹھ جائے۔ جب نظر اُٹھ جاتی ہے تو اللہ پاک دہانہ کھول دیتے ہیں۔ پھر بے حساب دیا جاتا ہے اور وہ بے حساب آگے بڑھاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اُن کو مخلوق تک پہنچانے کے لئے ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے" اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِی" کہ بے شک میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطاء فرمانے والے ہیں۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر حقیقت میں چلتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ ایسے وقت کے لئے ایسا بنا لیتے ہیں جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کے لئے بنایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر اگر اعمال کرتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر اُن کے احوال بھی آگے چلتے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر اُن کو دیا بھی جاتا ہے اور آگے اُن کو منتقل بھی فرماتے ہیں۔ یہ حضرات ماشاء اللہ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں۔ تو ایسے خوش قسمت لوگوں میں حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

متن: بغیر کچھ کھائے پیئے ہمیشہ روزہ سے ہوتے تھے، اویسی طریقے سے نوازے گئے تھے اور یہی نوازش بلاواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے عنایت ہوئی تھی، اسی وجہ سے آپ سورج سے بھی زیادہ مشہور تھے، صاحبِ نظر تھے، اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوق کو ترک فرما چکے تھے، اُن کی مجلس میں تاثیر تھی، کبھی کسی شخص کو رمز کے طور پر اشارت فرماتے، تو وہ شخص وجد میں آتا، اسرار کے

رموز ان پر منکشف ہوگئے تھے، وضو کرنے کی فضیلت اور اُس کے تمام اسرار اُن پر کھل گئے اور اسی لیے آپ نماز میں بے حد لطف و لذت محسوس کرتے تھے، آپ دن رات عبادتِ الٰہی میں منہمک اور مصروف رہا کرتے تھے، اور عبادت گزاری میں روز افزوں ترقی فرماتے تھے۔

تشریح۔ اس میں بھی وہی اشکال لوگوں کو آسکتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص فنا فی اللہ ہو جائے تو پھر تو انسان سب کچھ کر لے گا۔ لیکن میں آپ کو اس مسئلے میں ایک صاف بات بتاؤں۔ آپ کے پاس دس روپے ہیں آپ دس روپے میں وہ کرد کھائیں جو آپ دس ارب روپے میں کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو دس ارب کا اجر دے دے گا۔ لیکن اگر آپ دس روپے میں مشغول ہیں اس دس روپے میں اللہ تعالیٰ کیلئے خرچ نہیں کر سکتے اور کہہ رہے ہیں کہ جب میرے پاس دس ارب آئیں گے تو میں یہ کروں گا میں وہ کروں گا تو آپ کی بات میں صداقت نہیں ہے اس لئے کہ جو کچھ اس وقت آپ کے پاس ہے اُس میں آپ اللہ کے لئے نہیں دے رہے۔ بات سمجھ میں آرہی ہے؟ اسی طرح باقی چیزوں میں جو آپ کے پاس ہے اُس میں جتنی آپ کی طاقت ہے وہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اُس کی بھی توفیق بھی عطاء فرما دیں گے جو آپ کی خواہش ہے۔

یہاں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ پر نظر ہی نہیں ہوتی۔ نتیجتاً اُدھر ہی رُک جاتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے دروازہ اور ایک ہوتا ہے دروازے میں آنے والی چیز۔ یہ دو مختلف باتیں ہیں۔اور ایک یہ ہے کہ جو دروازے میں آنے والی چیز کا کرنے والا ہے اُس پر نظر ہو۔ یہ اُس سے بھی اعلیٰ نظر ہے۔ تو جو عارف ہوتا ہے اسکی آخر پر نظر ہوتی ہے وہ نہ دروازے پر نظر رکھتا ہے نہ دروازے میں اندر آنے والی چیز پر نظر رکھتا ہے بلکہ جو اُس چیز کو لا رہا ہے اُس پر نظر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ مجھے تنخواہ کے ذریعے سے مل رہا ہے میری نظر تنخواہ پر ہے۔ ٹھیک ہے لیکن جو تنخواہ بانٹ رہا ہے اس پر نظر ہو تو کیا پھر بھی تنخواہ پر نظر ہوگی؟ اگر کسی کی دس روپے پر اتنی نظر ہے کہ یہ دیا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا تو ٹھیک ہے پھر دوسروں پر اعتراض بھی نہ کرو کہ دس روپے

میں کر رہے ہیں۔ یہ بھی نہ کہو کہ مجھے دس ارب مل جائیں تو میں بھی ایسا کروں گا۔ ہم کہتے ہیں میں جو کچھ کر رہا ہوں اسکی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں تصوف کے اندر جو اصل چیز ہے وہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کہوں مجھے اس کی حقیقت بھی حاصل ہو جائے۔ جب میں کہوں سبحان اللہ، تو سبحان اللہ کی حقیقت بھی مجھے حاصل ہو، میں جب اللہ اکبر کہوں تو اللہ اکبر کی حقیقت بھی مجھے حاصل ہو۔ اُس وقت میں واقعی اُسکو بڑا سمجھوں۔ کسی اور کو بڑا نہ سمجھوں۔ اللہ اکبر کا مطلب ہے سب سے بڑا تو باقی چیزیں میرے سامنے ہیچ ہو چکی ہوں۔ ایک ہوتا ہے اسمِ ذات اور ایک ہے ذات۔ اسمِ ذات سے ذات پر آنا۔یہی تو صوفی آپ کو کراتا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو باقی چیزیں خودبخود حاصل ہو جاتی ہیں۔ اللہ والوں کی اپنے اوپر نظر نہیں ہوتی بلکہ جو بھی وہ کر رہے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

اگر آپ بڑے بڑے کارخانوں میں چلے جائیں تووہاں ایک Prototype ہوتا ہے اُس پر ایک چھوٹا سا Probe چل رہا ہوتا ہے اور اُس کو کاٹ رہاہوتا ہے۔ دوسری طرف ایک بہت بڑا کٹر ، کمرے جتنا ایک بہت بڑی چیز کو اسی طرح کاٹ رہا ہوتا ہے۔ اب یہ چھوٹی سی چیز کو کاٹ رہا ہے اُس کے Drawing paperپر اور اُدھر ایک بہت بڑا کٹر عملی طور پر ایک بہت بڑی چیز کو کاٹ رہا ہوتا ہے۔ یہ کارخانے کے اندر ہوتا ہے لیکن یہ اُس وقت ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک سسٹم بنا ہو تب ہی ہو سکتا ہے۔ اسمِ ذات سے ذات کی طرف آنا یہ بھی اسی طرح ہے کہ اسم کے ذریعے سے ذات تک پہنچا یا جاتا ہے کیونکہ اسم ظاہر ہے اور ذات باطن ہے۔ اسم کے ذریعے سے انسان کے ساتھ منسلک چیزیں آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہیں اور وہ مسمّٰی کی طرف جاتا ہے۔ تو صوفی تو آپ کو یہی کرا سکتا ہے کہ اسم کے ذریعے سے آپ کو آگے بڑھائیں۔ تو اسم کے ذریعے سے انسان مسمّٰی کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور اُس کی اپنی چیزیں آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اُس کی اپنی چیزیں بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔ایسے شخص کو فانی کہا جاتا ہے۔ پھر وہ کسی بھی چیز کو اپنا نہیں سمجھتا بلکہ ہر چیز میں اُس کی نظر اللہ پر ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اُس کو ہر ہر عمل کی حقیقت نصیب ہوتی ہے۔یہی صحیح معنوں میں اللہ والے ہوتے ہیں۔

اسی لئے جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ اپنے پر نظر نہیں رکھتے بلکہ اللہ پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا اپنا آپ فانی ہو چکا ہوتا ہے۔"وَمَاتَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ"ان کو حقیقی معنوں میں ملا ہوتا ہے وہ اپنے عمل کو کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہوتے۔ کہتے ہیں یہ تو اللہ کی توفیق ہے۔ مثلاً اس وقت میں یہ بات کر رہا ہوں خدا کی قسم اللہ نہ چاہے میں ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا اب اگر اس وقت میں اس کو اپنا کمال سمجھوں اور میں کہوں کہ میں نے کیا زبردست تقریر کر لی۔تو مارا جاؤں گا۔اگر میں بطور Observer کہوں کہ دیکھو اللہ تعالیٰ مجھ سے اُگلوا رہا ہے جس طرح آپ سن رہے ہیں ایسے میں بھی سن رہا ہوں تو کیا مجھے اپنی بات پہ غرور آئے گا؟ تکبر آئے گا ؟دیکھو اللہ مجھ سے یہ بھی اگلوا رہا ہے یہ بھی اگلوا رہا ہے۔ مجھے خوشی ضرور ہو گی لیکن میں اس کو اپنی چیز نہیں سمجھوں گا لہٰذا حجابِ نفس نہیں ہو گا۔اسی چیز سے بچنے کی بات ہے۔ میرا بیٹا ہے محمد ،اب بڑا ہے اُس وقت چھوٹا سا تھا۔ تو میرا ایک بیان جو ریکارڈ تھا وہ میں کمپیوٹر پر سن رہا تھا وہ حیران ہو گیا کہ میں اپنی تقریر سن رہا ہوں تو وہ بولا ابو کیا کر رہے ہیں ؟ میں نے کہا سُن رہا ہوں۔ کہا کیا سُن رہے ہیں، آپ اپنا بیان سن رہے ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ بچہ پریشان ہو گیا کہ کیا کہہ رہے ہیں جھوٹ بول رہے ہیں۔ کہا ابو یہ آپ کا بیان ہے نا ں میں آپکی آواز کو پہچانتا ہوں یہ آپ کی آواز ہے۔ میں نے کہا یہ میرا بیان نہیں ہے۔ اُس نے کہا پھر یہ کس کا بیان ہے؟ میں نے کہا یہ جو سامنے بیٹھے تھے ان کا بیان ہے یہ اللہ پاک نے ان کے لئے بھیجا ہے اب میں سن رہا ہوں کہ اس میں میرے لئے کیا چیز ہے؟ وہ تو بچہ تھا اُس کو میری بات سمجھ نہیں آئی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن اصل بات یہی ہے۔

میں اگر کمرے کے اندر بیٹھ جاؤں تو کیا اس طرح کا بیان کر سکتا ہوں جیسے آپ کے سامنے ہوا ؟سوال ہی پیدا نہیں ہو تا۔ ناممکن ہے اور کئی بار تجربے ہو چکے ہیں۔یقین آنا چاہئے کہ یہ میرا نہیں ہے اگر میرا ہوتا تو کمرہ میں زیادہ اچھا ہونا چاہئے کیونکہ وہاں یکسوئی زیادہ ہے ،سوز زیادہ ہے، فکر زیادہ ہے، اِدھر اُدھر کی چیزیں مجھے متاثر نہیں کر رہی لہٰذا وہ زیادہ بہتر ہونا چاہئے لیکن اب وہاں پر ایک بھی چیز نہیں۔

اب میں آپ کو ایک عجیب واقعہ سناتا ہوں حضرت مولانا اشرف سلیمانی اللہ تعالیٰ

حضرت کے درجات بہت بلند کرے ہمارے شیخ ہیں۔ حضرت کی باتیں میں اکثر کرتا رہتا ہوں کہ حضرت نے یہ فرمایا، اور حضرت نے یہ فرمایا، اکثر میں حضرت کی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ تو کسی نے مجھے کہا کہ آپ پر لازم ہے کہ آپ حضرت کی باتیں کتاب میں لے آئیں، تحریر میں لے آئیں ،کیونکہ اس سے لوگوں کو بہت فائدہ ہو گا۔ مجھے ان کی بات سمجھ آگئی کہ درحقیقت بات تو صحیح ہے واقعی حضرت کی باتیں آنی چاہئیں۔ لہٰذا میں لکھنے بیٹھ گیا۔ یقین کیجئے ایک مضمون جو چار پانچ صفحوں کا تھا اُس سے زیادہ نہیں لکھ سکا اور وہ باتیں جو میں عام طور پر کرتا ہوں جمع ہو جائیں تو اُس سے کئی کتابیں بن سکتی ہیں۔ کیا بات ہے چار پانچ صفحوں سے زیادہ کیوں نہیں لکھ سکا ؟ وجہ کیا تھی۔ میں اپنی طرف سے لکھ رہا تھا اور جب دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہوں تو اللہ ان کے لئے بھیج رہا ہوتا ہے۔ میں جو بات کر رہا ہوں یہ میری بات نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا تھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ ایک دن اُن سے فرمایا آپ لوگوں کو جتنا مجھ سے حاصل ہوا اس سے زیادہ میں نے آپ لوگوں سے حاصل کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت آپ کیا کہہ رہے ہیں ہم تو آپ کے شاگرد ہیں ہم نے تو آپ سے حاصل کیا ،آپ نے ہم سے کیا حاصل کیا؟ یہ کون سی بات ہے؟حضرت نے فرمایا جو مضامین آپ لوگوں کے لئے میرے دل پہ القاء ہوتے تھے وہ آپ لوگوں کے ذریعے سے ہی تو مجھے ملے ہیں۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دلوایا۔ یہ بات سب جگہ ہوتی ہے کوئی مان لیتا ہے اور کوئی نہیں مانتا اور اس کو اپنا بنا لیتا ہے کہ یہ تو میں نے کیا اور کچھ لوگ اس حقیقت کو مان لیتے ہیں کہ میں نے تو نہیں کیا ،یہ تو اللہ تعالیٰ نے کیا اور ہم زبانی طور پہ کہتے ہیں"وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ" "وَاللهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَّاب" لیکن الفاظ کی حقیقت نہ ہونے کی وجہ سے کیا ہوتا ہے؟ ہم پھر بھی ان کے پیچھے لگے ہوتے ہیں کہ ہماری بات کیوں نہیں مانی۔ حالانکہ ہمارا کام تو صرف پہنچانا ہے بس پہنچا دیا بات ختم ہوگئی۔

"وَاللهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَّاب" کا یہی مطلب ہے کہ اصل بات تو اللہ کو معلوم ہے۔ تو تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو؟ باتیں تو بہت کرتے ہو لیکن باتوں کی حقیقت نہیں ہوتی اب اگر باتوں سے حقیقت کی طرف آجائیں تو کام ہوتا ہے۔

حاجی عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغی جماعت کے بہت بڑے تھے انہوں نے یہ بات اپنے ساتھیوں کو بتائی تھی فرمایا جو ساتھی یعنی تبلیغ میں چلنے والا معمولات کا اہتمام نہیں کرتا یعنی اللہ سے مانگنا، ذکر کرنا، اس کا اہتمام نہیں کرتا وہ باتونی ہے۔ باتونی سے مراد کیا ہے؟ اُس کے پیچھے حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت تب آئے گی جب پیچھے اس کا کنکشن آئے گا۔ ایک دفعہ ایک صاحب تعلیم کر رہے تھے، ایک صاحبِ کشف بیٹھے ہوئے تھے اللہ نے ان کو بڑا مقام دیا تھا وہ اُٹھ کر چلے گئے کسی نے جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کنکشن نہیں ہے اوپر کنکشن کٹا ہوا ہے صرف باتیں کر رہے ہیں کنکشن نہیں ہے۔ اب بعض کا پتہ چل جاتا ہے بعض کا نہیں چلتا لیکن بات تو یہی ہے۔ کنکشن ہو گا تو بات میں جان آئے گی۔ کون اپنے نفس کی طرف سے کہہ رہا ہے اور کون اللہ کی طرف سے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جو اپنے نفس سے کہہ رہا ہے ان کی بات ان تک ہے۔ جو اللہ کی طرف سے کہہ رہا ہے ان کی بات اللہ تک ہے یہی فرق ہوتا ہے۔

ہماری طریقت میں جس چیز کے بارے میں بات کی جائے وہ یہی ہے کہ ہماری بات ہماری نہ رہے ہماری بات اللہ کی بن جائے۔ ہمارا عمل ہمارا نہ رہے بلکہ اللہ جل شانہ کی طرف اس کی نسبت ہو کہ اللہ نے کروا دیا یہی چیز اگر آجائے تو سبحان اللہ پھر کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین "وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ"

چند ضروری اصطلاحات کی تشریح

عبقات سے

از

حضرت شاہ اسمعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

تشریح و ترتیب

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

اصطلاحات کی اہمیت :

اصطلاح کسی مفہوم کو سمجھنے کا آسان راستہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اک ہی مفہوم جب گفتگو یا تحریر میں بار بارآرہا ہو تو اس کو ہر بار نئے سرے سے سمجھانا بڑا مشکل ہوجاتاہے۔ اس کے لئے کسی اصطلاح کو وضع کیا جاتا ہے اور پھر جہاں جہاں وہ مفہوم آرہا ہو تو بجائے اس کے کہ اُسی کو سمجھایا جائے اُس کی اصطلاح کو استعمال کر لیا جاتا ہے۔یعنی اصطلاح چند مختصر الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جس کے اندر ایک تفصیلی مفہوم پنہاں ہوتا ہے۔

اصطلاح مبتدی کے لئے سیڑھی ہوتی ہے اور منتہی کے لئے عیب ہوتا ہے۔ سیڑھی اس لیے کہ مبتدی کسی بھی فن کو اس کی اصطلاحات ہی کی مدد سے سیکھ سکتا ہے۔اور عیب اس لیے کہ منتہی کو خود سمجھنے کے لیےاصطلاحات کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ دوسروں کو سمجھانے کے لیے وہ انہیں استعمال کرسکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی سمجھانے میں آسانی کے لیےخود اپنی اصطلاحات بھی بنا لیتا ہے۔

کائنات کی تخلیق، خالق اور مخلوق کا تعلق اور ان سے متعلقہ حقائق کے بارے میں بڑے بڑے صوفیائے کرام کو اپنے کشف اور الہام کے ذریعے کچھ ادراکات ہوئے۔اس کو انہوں نے ظاہر بھی فرمایا۔ یہ ان کی تحریروں، مکتوبات(خطوط) وغیرہ میں آج بھی

ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آج ہم عقل اور نقل کے ذریعے ایک حد تک ان کو سمجھ اور پرکھ (Verify) سکتے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے ان معارف کو ہم تک پہنچانے کے لئے، بعض ابتدائی مفاہیم (Concepts) کے لئے کچھ اصطلاحات (Terminologies) وضع کیں۔ وقت کے ساتھ زبان اور سوچنے کے انداز میں تبدیلی کی وجہ سے اب ان کا سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ ذیل میں ان بزرگوں کی اصطلاحات کو آج کل کی زبان میں پیش کیا گیا ہے:

1:- **ثبوتِ معدومات :** یہ ایک اصطلاح ہے جو الٰہیات میں استعمال ہوتی ہے۔ عام طور پر ہمارے نزدیک چیزوں میں خصوصیات اُس وقت آتی ہیں جب وہ پیدا ہو چکی ہوتی ہیں۔ لیکن وجود میں آنے سے پہلے بھی چیزوں کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ مثلاً درخت بیج سے پیدا ہوتا ہے لیکن اگر اُس بیج کو کوئی دیکھ لے تو کیا اُس کو درخت نظر آتا ہے؟ یہاں تک کہ اگر کوئی مالی نہ ہو تو اُس کو بیج کے پھٹنے کا بھی پتہ نہیں چلتا لیکن مالی کو پتہ چل جاتا ہے کہ درخت اُگنا شروع ہو گیا۔ بیج کو تصور میں لانے سے ہی اُس سے پیدا ہونے والے درخت کے خصوصیات کا بیج کے ساتھ وابسطہ ہونا ثبوتِ معدومات کہلاتا ہے۔

انسان کا یہ تصور اگرچہ ذہنی ہے اور خارجی وجود نہیں رکھتا لیکن ہر دوسرے تصور سے مختلف بھی ہے۔ اس کی تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ معدوم (Non Existence) کی حالت میں ہی چیزوں کے موجود ہونے کے بعد ان میں پائی جانی والی صفات کی پیشگوئی (Prediction) کو ثبوتِ معدومات کہتے ہیں- اس کو آج کل کی زبان میں design بھی کہہ سکتے ہیں۔

ثبوتِ معدومات گو بظاہر ایک مشکل اصطلاح لگتی ہے، لیکن اصل میں ہم سب جانتے ہیں کہ کوئی بھی چیز بنانے سے پہلے یا کوئی کام کرنے سے پہلے ہمارے ذہن میں اس کا ایک خاکہ بنتا ہے۔ آگے اسی چیز کو اس خاکے کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ خاکہ کے لفظ میں زیادہ وضاحت نہیں پائی جاتی لیکن سائنس کی ترقی کے دور میں ڈیزائن کی اہمیت کسی سے چھپی ہوئی نہیں اس سے اس کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ مختلف صنعتوں (Industries) میں جو چیزیں (Products) بنتی ہیں ان کے پہلے سے طے شدہ Design ہی سے Manufacturing process کنٹرول ہوتا ہے اور finished product کی

کوالٹی بھی اسی Design یا Desired product سے Compare کرکے معلوم کی جاتی ہے۔چیز (Product) جو بننے سے پہلے معدوم (Nonexistent) ہے Manufacturing کے بعد موجود (Existent) ہو جاتی ہے اور اس کا design ہی اس کے معدوم ہونے کی حالت میں ثبوت تھا۔

2:- مبداء تعین و تشخص:(Origin of particularization)

کسی چیز کی شناخت جس چیز سے ہو سکے وہ اس کا مبداء تعین و تشخص ہوتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں۔

1۔ مابہ الامتیاز: مابہ الامتیاز کے ذریعے سے ایک ہی نوع کے افراد کے درمیان فرق کو دیکھا جاتا ہے جس سے نوع کے ہر فرد کی پہچان ہوتی ہے۔ جیسے انسان ایک نوع ہے اور تمام انسان اس نوع کے افراد ہیں۔ اب کالا آدمی بھی اس نوع کا فرد ہے اور گورا آدمی بھی اس نوع کا فرد ہے لیکن جس خصوصیت کی وجہ سے کالا آدمی گورے آدمی سے مختلف ہے وہ اُس کا رنگ ہے۔ لہٰذا رنگ دونوں آدمیوں کے درمیان امتیاز کا باعث ہے۔ اور یہی رنگ دونوں کا مابہ الامتیاز ہے۔

2۔ مابہ الوجود: وہ خصوصیت جس کی وجہ سے کوئی چیز ثبوت کے درجہ سے نکل کر وجود میں آتی ہے کیونکہ جب تک ثبوت کسی ایسی چیز کے ساتھ نہ ملے جس کی وجہ سے ثبوت عدم سے نکل کر وجود میں آئے تو وہ وجود میں نہیں آسکتا۔ پہلے وہ چیز جو ثبوت کے درجے میں تو موجود تھی لیکن خارج میں اس کا وجود نہیں تھا تو اس کو ہم شئ نہیں کہہ سکتے تھے جس کی طرف اشارہ کیا جاسکے۔جب یہ خارج میں آ موجود ہوا تو اب اس کو شئ کہہ سکتے ہیں۔ جب تک کسی چیز کا صرف ذہنی تصور ہوتا ہے تو خارج میں وہ صفر ہوتا ہے اب اس کے ساتھ ذہن میں جتنی چیزیں ملائیں گے تو وہ چونکہ خارج میں صفر ہوں گے اور صفر کے ساتھ جتنے بھی صفر جمع ہو جائیں تو نتیجہ صفر ہوتا ہے اس لئے خارج میں وہ صفر ہی رہے گا لیکن اگر اس کو خارج میں موجود کسی چیز کے ساتھ وابستہ کریں گے تو اس کا خارج میں وجود ثابت ہو جائے گا یہی اس کا مابہ الوجود یعنی Source of existence ہو گا۔تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو چیز درجہ ثبوت میں ہوتی ہے وہ اس مبداء

تعین یعنی مابہ الوجود Source of existence کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ ثبوت کے درجہ میں جو خاکہ ہوتا ہے اس کو منشاء کہتے ہیں۔ مثلاً کرسی کا نقشہ جو ذہن میں موجود ہے اُس کو منشاء کہتے ہیں۔ لہٰذا کرسی کا خارج میں موجود ہونا دو چیزوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ ایک مبداء یعنی لکڑی اور دوسرا منشاء یعنی کرسی کا نقشہ جو ذہن میں موجود ہے۔ ان دونوں یعنی مبداء اور منشاء کا جب آپس میں تعلق بن جاتا ہے تو خارج میں کرسی وجود میں آجاتی ہے۔

حقیقت، ظل، قیوم اور حصہ کی اصطلاحات

یہ اصطلاحات حضرت مجدد صاحبؒ اور دوسرے عارفین کے کلام کو سمجھنے کے لئے اہم ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لئے مثال درج ذیل ہے۔

مثلاً ایک نجار Carpenter نے ایک کرسی بنانی چاہی۔ پہلے اس کے ذہن میں اس کرسی کا ایک تصور ، یا ذہنی خاکہ بنتا ہے۔ اس کے بعد وہ لکڑی کو لے کر اس پر کام کرتا ہے۔ لکڑی مختلف حالتوں سے گزر کر آخر ایسی حالت میں آجاتی ہے کہ اس کو ہر دیکھنے والا کرسی سمجھتا ہے۔ اس مثال سے ہم مندرجہ بالا اصطلاحات کی تشریح کریں گے۔

حقیقت: کرسی کی مادی تخلیق سے پہلے اس کے ذہنی تصور کو اس کی حقیقت کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ خارجی کرسی کی اصل ہے جس کی بنیاد پر کرسی کی تخلیق ہوئی ہے۔ ثبوت معدومات کی اصطلاح بھی اسی مفہوم(ذہنی تصور) کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

قیوم: لکڑی جو ذہنی کرسی کو وجود دیتی ہے اور خارج میں اس کے وجود کو قائم رکھنے کی بنیاد ہے۔ اگر لکڑی ختم ہو جائے مثلاً لکڑی کو دیمک کھا جائے تو کرسی کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اس کو قیوم کہتے ہیں۔اس کی اس حیثیت کی وجہ سے کہ یہ کرسی کو ایک شناخت بھی دے رہی ہے۔اسی کو مبداء تعین (مابہ الوجود) بھی کہتے ہیں۔

حصہ : لکڑی پر اس عمل کے بعد کرسی کی جو شکل بن گئی، اس کو حصہ کہتے ہیں۔ گویا وہ ذہنی کرسی (حقیقت) کا ایک حصہ ہے کیونکہ ذہن میں جو بھی چیز ہوتی ہے وہ کُلی ہوتی ہے اور یہ کرسی جو باہر موجود ہے اُس کُلی صورت کا ایک حصہ ہے۔ اس حصے کو ظِل

کہہ سکتے ہیں۔ گویا قیوم ظِل کو Contain رکھتا ہے۔ اس اصطلاح (ظِل) کو حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ استعمال فرماتے ہیں۔

لکڑی اور کرسی کی مثال سامنے رکھیں۔ لکڑی پر کام ہوتا رہا۔ بالآخر وہ کرسی بن گئی۔ اب اس سے کرسی کی صفات ظاہر ہونے لگیں۔ اب یہ بیٹھنے کے قابل ہوگئی۔

اب سوال ہے کہ کرسی میں یہ صفات کہاں سے آئیں؟ اِن صفات کا مبداء(Origin) کیا ہے؟ اور ان صفات کا مبداء سے ظاہر ہونے کی شرط کیا ہے؟

جواب: مبداء تو ظاہر ہے، لکڑی ہے۔ اگر لکڑی نہ ہوتی تو کرسی نہ ہی نہ بنتی۔ یعنی قیوم(یا مبداء تعین) ان صفات کا مبداء ہے جو کرسی میں آگئیں۔ دوسری طرف لکڑی سے صرف اسی وقت کرسی کی صفات ظاہر ہونے لگیں جب اس کی کرسی جیسی حالت بن گئی۔ یعنی اس کو دیکھنے سے کرسی کا خیال آنے لگا۔ اس لحاظ سے کرسی کی ذہنی صورت یا ماہیت(حقیقت) اہم ہے۔ اس ماہیت کو کرسی کے صفات کا منشاء کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ کرسی کی صفات کو ظاہر کرنے کی شرط ہے۔

ان دو باتوں پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے اور فرق سمجھنا چاہیے کہ کرسی کی صفات اور آثار میں لکڑی (قیوم) اور کرسی کی ذہنی صورت(ماہیت) کا کیا کیا کردار ہے؟

مندرجہ بالا مثال میں دیکھیں کرسی کا جو نقشہ ذہن میں ہے وہ باہر آکر ویسے نہیں بنی بلکہ اس کے مطابق لکڑی پر اچھا خاصا کام ہوا تو کرسی وجود میں آئی۔ پس کسی چیز کی ماہیت اس چیز کے وجود میں آنے کی منشاء ضرور ہے لیکن مبداء تعین(قیوم) کے بغیر ایسا ممکن نہیں۔ جو اس صورت میں لکڑی ہے۔

اس تمام بحث سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اُس میں چار چیزیں قابل غور ہیں۔

1. حقیقت کی اپنی ذات یعنی ماہیت یا مندرجہ بالا مثال میں کرسی کا نقشہ یا ڈیزائن۔
2. حقیقت کا وہ حصہ جس کے مطابق چیز وجود میں آئی۔ یعنی موجودہ مثال میں کرسی۔
3. وہ چیز جس سے یہ تیار ہوئی یعنی موجودہ مثال میں لکڑی۔

4. مبداءتعین (لکڑی) کی وہ حیثیت جس کی وجہ سے وہ حقیقت کے ایک خاص حصے اور فرد کے انتزاع(Extract) کا منشاء بن گیا۔

نوٹ: انتزاع Extract سے کیا مراد ہے؟ یہ جاننا عبقات کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ انتزاعی امور وہ ہوتے ہیں جو ظاہری موجود چیزوں سے اخذ ہوتے ہیں لیکن ان انتزاعی امور کا وجود الگ نہیں ہوتا۔ مثلاً چھت سے بلندی کا مفہوم منتزع ہوتا ہے، مثلاً کوئی کہے کہ چھت کی طرف دیکھو تو نظر بلندی کی طرف ہی جائے گی۔اسی طرح گاڑی سے حرکت منتزع ہوتی ہے۔یہاں بلندی چھت سے اور حرکت گاڑی سے الگ وجود نہیں رکھتی۔

ان چار چیزوں کو ہم چار اصطلاحات کے تعارف کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاحات بزرگوں کے تحریرات میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

1:- حقیقت کی اپنی ذات یاماہیت کو اسمائے کونیہ اور اعیانِ ثابتہ کہہ سکتے ہیں۔اسمائے کونیہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح ہے جبکہ اعیان ثابتہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح ہے۔

2:- کُلی ذہنی ماہیت کا وہ حصہ جو وجود میں آیا یعنی خارج میں موجود آنے والی چیز (موجودہ مثال میں کرسی) اس کو ظِل کہا جا سکتا ہے۔

3:- جس کی وجہ سے ظِل موجود ہوا۔مثلاً مندرجہ بالا مثال میں لکڑی کو قیوم یا مبداء تعین کہا جا سکتا ہے۔

4:- مندرجہ بالا مثال میں لکڑی کی وہ حالت جس کی وجہ سے وہ ذہنی کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہے اس کے لئے ہویت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ہویت ھو سے نکلا ہے اورھو اسم اشارہ ہے۔ تو جس چیز کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں آپ بعینہٖ اُس کو پا جائیں تو یہ ہویت ہے۔ یعنی مبداء(لکڑی) جو ہے وہ منشاء(ذہنی کرسی) کے ساتھ منسلک ہو جائے اور اُسی کی طرف آپ کی توجہ مرکوز ہو جائے تو یہ ہویت ہے۔

جِعلِ مرکب اور جِعلِ بسیط کی بحث:

کائنات کے تخلیق کی نوعیت کیا ہے؟ کیا مخلوق کی ذات اور اُس کی ماہیت دونوں

عدم سے براہ راست وجود میں آئی ہے؟اکابر صوفیاء کرام سے اس بارے میں مختلف آراء منسوب ہیں۔ ذیل میں ان کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

جِعل کسی چیز کے بنانے کو کہتے ہیں۔جعل مرکب سے مراد ایک سے زائد حصوں کو ایک ترکیب کے ساتھ جوڑ کر کوئی چیز بنانا ہے اور جعل بسیط سے مراد صرف ایک ہی چیز سے بنانا۔جعل کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا جواب ایک گروہ یہ دیتا ہے کہ یہ ماہیت کو قیوم کے ساتھ جوڑنے کا عمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ماہیت اور ماہیت کے قیوم کا باہمی ربط پیدا کرنا جِعل کہلاتا ہے۔اس کے بالعکس اگر ان کا ربط توڑ دیا جائے تو وہ چیز معدوم ہوجائے گی۔ مثلاً ذہن میں کرسی کا نقشہ موجود ہے لیکن جو کرسی اُس ذہنی نقشے کی بنیاد پر بنی تھی وہ توڑ دی گئی تو قیوم یعنی لکڑی کے ساتھ اس کا ربط ٹوٹ گیا۔تو ماہیت تو موجود ہے لیکن اس کا ظِل ختم ہوگیا۔ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ جعل وہ فعل ہے جو کسی چیز کو عدم سے وجود میں لے آئے۔ گویا جو چیز خارج میں موجود ہے وہی حقیقت اور ماہیت بھی ہے۔اگر اس بات کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب خارج میں موجود چیز ختم ہو جائے تو ساتھ ہی اس کی حقیقت بھی ختم ہو جاتی ہے۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس گروہ کے مطابق اگر ایک چیز جو کہ ایک ڈیزائن کے مطابق بنائی گئی ہے اگر ختم ہوجائے تو ساتھ ہی اُس کا ڈیزائن بھی ختم ہو جائے گا۔یہ بات وہی لوگ کہہ رہیے ہیں جو کہتے ہیں کہ معدومات کا ثبوت ممکن نہیں۔ یعنی اگر کوئی چیز خارج میں نہیں ہے تو اُس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔بعض حضرات نے ان اختلافات سے تنگ آکر جِعل کا سرے سے انکار کردیا۔ حالانکہ جیسا کہ معدومات کے ثبوت کا انکار ایک فضول بات ہے اسی طرح جِعل سے انکار بھی فضول حرکت ہے۔

وجود اور عدم کی اصل تشریح: جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ماہیت کے کسی حصے کا (کیونکہ ایک ماہیت کے کئی حصے ہوسکتے ہیں)جب اس کے قیوم کے ساتھ رابطہ جوڑا جاتا ہے تو اس کا ظِل وجود میں آتا ہے اور اگر ان کا(ماہیت اور اُس کے قیوم کا) آپس میں رشتہ توڑا جاتا ہے تو وہ ظِل معدوم ہوجاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ماہیت ہی ظِل کی صورت میں آ موجود ہوجاتی ہے۔ یعنی اس طرح تو نہیں ہوتا کہ ڈیزائن باہر آکر موجود ہو جاتا ہے۔اس طرح

کسی چیز کے معدوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قیوم کے ساتھ ماہیت کا جو رشتہ پیدا ہو گیا تھا اس کو توڑ کر ثبوت کے درجے میں اس ماہیت کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ جیسے کرسی والی مثال میں کرسی کا لکڑی سے رشتہ توڑ کر درجہ ثبوت میں واپس کیا جائے ایسا نہیں ہوتا۔

پس جِعل (بنانے کا عمل) کو اگر ظِل کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ یہ اس ظِل کو عدم سے وجود میں لانے کا نام ہے تو یہ جِعلِ بسیط یعنی ایک ہی شے سے بنانا کہلائے گا اور اگر یہ سمجھیں کہ ماہیت کے ظل کو قیوم کے ساتھ جوڑا گیا گویا دو چیزوں میں اس نے ربط پیدا کیا تو یہ جعلِ مرکب کہلاتا ہے۔ گویا جعل کے عمل کو بسیط یا مرکب کہنا نقتہ نظر کے حساب سے ہے۔ یعنی یہ لفظی جھگڑے ہیں اور نزاعِ لفظی کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس بحث سے یہ نتیجہ آسانی کے ساتھ نکالا جاسکتا ہے کہ بعض حضرات (مثلاً شیخ محی الدین ابن عربیؒ) جو کہتے ہیں کہ اعیانِ ثابتہ نے وجود کی بُو بھی نہیں سونگھی ان کے مطابق اعیان سے یہاں مراد ظِل نہیں ماہیت ہوا اور ماہیت کا خارج میں وجود نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ قول صحیح ہے۔ جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس امکانی عالَم، جو ہمارے سامنے ہے، کی اصل تو معدوم ہے لیکن اس کا ظِل موجود ہے اور کچھ کہتے ہیں یہ اسماء کے ظِلال ہیں اور بعض یہ کہتے ہیں کہ عالَمِ کائنات یعنی یہ کائنات خود قیوم ہے مقید ہونے کے اعتبار سے جیسے لکڑی کو مقید کرنے سے کرسی بن جاتی ہے۔

ان بحثوں میں یہ نظر آتا ہے کہ ہر گروہ عالَم کی الگ تعریف کر رہا ہے۔ ان کی اپنی اپنی تعریف کے مطابق ہر ایک کی بات صحیح ہے۔

عالَمِ امکان سے مراد اگر امکانی حقائق یعنی ماہیت ہو تو پھر عالم امکان معدوم کہلائے گا کیونکہ ماہیت ظاہر نہیں ہوتی۔ صرف ماہیت کی وجہ سے جو چیزیں ظاہر میں وجود میں آئی ہیں وہ دنیا میں ہوتی ہیں اور اگر عالَمِ امکان سے مراد ماہیت کے وہ حصے لئے جائیں جو اپنے قیوم کے ساتھ جڑ کر وجود میں آرہے ہیں تو پھر اسماء کونیہ کے ظِلال کا نام عالَمِ امکان ہے۔ اس صورت میں قیوم ہی عالَمِ امکان ہو گا کہ اس کے ساتھ یہ ظِلال جُڑ کر وجود میں آتے ہیں۔

اس کتاب میں جو طریقہ حقائق و معارف کو سمجھانے کا اپنایا گیا ہے وہ کمپیوٹر پروگرامنگ

سے مشابہ ہے۔ یعنی پہلے چند بدیہی Common sense باتوں کو ذہن نشین کرایا جاتا ہے پھر ان کی مدد سے گہرے حقائق تک پہنچایا جاتا ہے۔

ان حقائق کا جاننا کس کے لئے ضروری ہے؟

ان کا جاننا ہر ایک کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ان کا جاننا یا تو مبتلاء بہ کے لئے ہے یا مقتداء کے لئے۔ مبتلاء بہ وہ ہے جس کا ذہن آج کل کے میڈیا سے متاثر ہو چکا ہو اور وہ دین کی بنیادی باتوں مثلاً وجود باری تعالیٰ کے متعلق شکوک وشبہات کا شکار ہو چکا ہو اور مقتداء وہ ہے جس نے لوگوں کی دینی رہنمائی کرنی ہو۔

کائنات کے واحد قیوم کی عقلی دلیل:

چند چیزوں میں آثار اگر مشترک ہوں، تو ان آثار کا مبداء یا Origin بھی مشترک ہوگا- مثلاً جن چیزوں سے گرمی یا سردی کے آثار ظاہر ہورہے ہیں، اس گرمی یا سردی کا Origin بھی ان سب میں مشترک ہوگا۔ یہ اصول پوری کائنات کا ایک ہی واحد قیوم، جو ایک کشفی حقیقت ہے، کو ثابت کرنے کے عقلی دلائل کی بنیاد ہے۔ مندرجہ بالا اصول کو مسلمان فلاسفہ بھی توحید کے دلائل میں استعمال کرتے آرہے ہیں۔

سائنس کے حدود:

اصل میں مشکل یہ ہے کہ سائنس Ever growing ہے اور Never ending ہے تو Never ending ہونے کے لحاظ سے اسکی جو Ever growing ہو رہی ہے تو یہ کبھی بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا کہ اس پر ساری چیزیں کُھل جائیں۔ سائنس ہر چیز کو الگ الگ دیکھ رہا ہے یعنی جو چیز جس کے سامنے ہے وہ اُس کو Study کر رہا ہے۔اُن کو Globalize کرنے والا یا ایک اصول کے مطابق کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ سائنسدان جو کہ تمام چیزوں کا ایک خالق ماننے میں Confuse ہیں اُس کی وجہ یہی ہے۔

کچھ لوگ جو توحید یعنی خالق کی واحد ذات کے منکر ہیں،وہ مسلمان فلاسفہ کے اس اصول کو رد کرکے کہتے ہیں کہ واجب الوجود (Essential-

being) ہونے کی صفت ایک ایسی صفت ہے جس کا کئی مختلف ہستیوں میں پایا جانا ممکن ہے۔اس کے لئے ہمیں ایک واحد ذات ماننے کی ضرورت نہیں۔ توحید کی ایک واضح دلیل قرآن مجید میں یہ آئی ہے کہ ایک سے زائد خداؤں کی صورت میں عالم میں فساد برپا ہو جاتا۔ کائنات کے اجزاء میں موجود ہم آہنگی نہ رہتی۔ اس قرآنی دلیل کا جواب توحید کے منکرین یہ دیتے ہیں کہ جب کائنات کے اندر مختلف ہستیاں باہم مل کر مربوط نظام چلاسکتی ہیں، تو ایک سے زائد خداؤں میں ایسا کیوں ممکن نہیں؟ ان کے اس سوال کا جواب مسلمان فلسفی یہ دیتے ہیں کہ کائنات کے اندر مختلف نظاموں میں جو مختلف مخلوقات جکڑی ہیں اور مل کر اسے چلارہی ہیں، اس کی وجہ ان سب کی محتاجی اور آپس میں ایک دوسرے پر Dependence ہے۔ جبکہ واجب الوجود ذات کہلاتی ہی وہ ذات ہے، جس کے سب محتاج ہوں اور خود وہ کسی کی محتاج نہ ہو۔ اگر بالفرض ایسی بے نیاز ذات ایک سے زیادہ ہوں، اور پھر بھی کائنات کا نظام چلانے میں ایک دوسرے سے Coordinate کرنے پر مجبور ہوں، تو وہ ذات بے نیاز ہی نہیں کہلاسکتی۔
مسلمان فلاسفہ کی اس دلیل میں بھی آثار یعنی محتاجی یا عدم محتاجی کے اشتراک کو خود حقائق یعنی مخلوقیت اور خالقیت کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

تمام امکانی حقائق یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ ہے ان سب کا قیوم ایک واحد شخصی امر ہے۔اسی امر سے سب پیدا ہوئے اور سب جتنی دیر ہوں گے ان کو موجود اور برقرار رکھنے والی قوت وہی ہے۔ اگر اس دعوے کو نہیں مانا جائے گا اور متعدد قیوموں کا نظریہ پیش کیا جائے گا تو ظاہر ہے ان تمام قیوموں میں قیومیت کی صفت اور خود موجود ہونے کی صفت مشترک ہوگی۔ان میں سے ہر ایک ماہیتوں کا قیوم ہوگا اور ان کے تمام آثار کے ظہور کا باعث ہوگا۔الغرض قیومیت کی ساری صفات ان میں مشترک ہوں گی۔پس متعدد قیوموں میں یہ چیزیں جو مشترک ہیں تو ان کے متعلق کیا حکم ہوسکتا ہے؟ اگر یہ کہ ان کا شخصی وجود سب میں مشترک ہے تو بداہتاً یہ ممکن نہیں جیسا کہ کسی انسان کی قیومیت دو بدنوں کے ساتھ ہو۔ بجائے شخصی وجود کے اگر اس کا احتمال ہو کہ ان خصوصیات کا جو کلی مفہوم ہے وہ ان میں مشترک ہے تو کلی مفہومات تو محض ذہنی اور اختراعی امور ہوتے ہیں۔خارج میں تو وہ معدوم ہوتے ہیں تو ایسی چیز جو معدوم ہو ایسی چیزوں میں جو بناء

وجود ہستیاں ہوں کیسے مشترک ہوسکتی ہیں ؟ لازماً موجودہ ساری کائنات میں جن میں یہ ساری قیومیت کی صفات پائی جائیں وہ ایک ہی ہونا چاہئے اور مذکورہ بالا قیومی خصوصیات اپنے کلی مفہومات کے ظلال یعنی خارجی افراد قرار دیئے جائیں اور یہی قیومی شخص جیسے سب چیزوں کا قیوم ہے اس طرح وہ ان قیومی صفات کا بھی قیوم ہوا۔البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان قیومی خصوصیات کا تعلق دوسرے ظلال سے پہلے قائم ہوا ہے۔

جس طرح کرسی بناتے وقت نجار کے ذہن میں جو کرسی کا نقشہ تھا اس کا مبداء تعین لکڑی تھی اور جب یہ کرسی بن گئی تو اس کا قیوم بھی وہی لکڑی ہے۔لکڑی ان دونوں یعنی اس کے نقشے اور اس بنی ہوئی کرسی کا قیوم ہے۔کائنات کے اندر جو حقائق اور ماہیتیں ہیں ان کے ساتھ بھی قیوم کا تعلق اس طرح ہے۔ پس قیوم میں ظل اور حقیقت دونوں کا وجود ہے اور اس کو کائنات کی تمام ہویتوں سے بھی تعلق ہے۔(ہویت کی تعریف اوپر چار اصطلاحات کے ذیل میں کی گئی ہے)۔ جیسا کہ کرسی والی مثال میں کرسی کی خاص ہویت کو لکڑی کے ساتھ وہی نسبت ہے جو کسی مطلق کو مقید کے ساتھ ہوتی ہے۔اسی طرح کائنات کی حقیقتوں کی ہویتوں سے قیوم کی نسبت وہی ہے جو مطلق کو مقید کے ساتھ ہوتی ہے۔

نوٹ: یہاں مطلق Generelize سے مراد کسی ذہنی قید سے آزاد ذات ہے اور مقید Bounded or restricted سے مراد وہ ذات ہے جب وہ قیود کے ساتھ پایا جائے جیسے لکڑی کی وہ حیثیت جب اس میں کرسی کی شکل و صورت نہ بنی ہو تو اُس وقت لکڑی آزاد ہے اور جب اس لکڑی سے کرسی بن جائے تو وہ کرسی کے نقشے کے ساتھ مقید ہے۔

پس اس کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے یہ ایک واحد ذات کے ساتھ موجود ہیں اور ان کا قیام و بقاء قرار و ثبات اس کے ساتھ وابستہ ہے۔اس صورت میں سب کی ذات ایک اور ماہیتیں مختلف ہیں جیسے کرسی اور تخت کی ماہیتیں مختلف ہیں لیکن ان دونوں کی ذات ایک یعنی لکڑی ہے جو ان کا قیوم ہے۔ مختصراً عرض کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ تمام موجود چیزوں میں وجود مشترک ہے اس لیے ان کا مبداء تعین یعنی قیوم بھی مشترک ہے۔

قیوم کو بعض نے ظاہر الوجود کہا۔بعض نے الوجود المنبسط علیٰ ہیکل الموجودات،بعض نے نفسِ رحمانی اور نفسِ کلیہ کہا کبھی اس کو اسماء الٰہیہ کا خاتم، کبھی تعبیر الرحمان اور کبھی "المرید" کہا گیا۔بعض لوگ غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ صوفیاء کے نزدیک خالق

کے وجود کی مثال کلی طبعی جیسی ہے۔یہ صوفیاء پر بہتان ہے اور ان کی بات نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ان لوگوں نے قیوم اور مُقوّم میں فرق نہیں جانا۔اگر ان دونوں کے فرق پر غور کیا جائے تو دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

قیوم اور مقوم میں فرق:

قیوم اپنی ذاتی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مایہتوں کو تھامے رکھتا ہے جبکہ مُقوّم ان مایہتوں کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ جیسے لکڑی کرسی کو تھامے رکھتی ہے تو ہم لکڑی کو کرسی کا قیوم کہتے ہیں۔ اس کے برعکس کرسی کے اجزاء جیسے سیٹ، ہینڈل، ٹانگیں وغیرہ کو دیکھ کر اُن کو آپس میں اپنے ذہن میں جوڑ کر کرسی کا مفہوم کوئی اخذ کرتا ہے تو ان سب اجزاء کو دیکھنے والے کے لحاظ سے مُقوّم کہیں گے۔

کائنات کے واحد قیوم کے خلاف ایک نظریہ اور اُس کا رد

شیخ ابو لحسن الاشعری کے ساتھ ایک غلط بات منسوب کی جاتی ہے وہ یہ کہ شیخ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کے وجود کی حقیقت ہر دوسری چیز کی وجود سے بالکل مختلف Nature کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آدمی اور گھوڑا جو کہ الگ الگ وجود رکھتے ہیں ان دو وجودوں کی حقیقت یا Nature ہی مختلف ہے۔ یہ گویا واحد قیوم کے نظرئے کے بالکل مخالف ایک نظریہ ہے کیونکہ اس صورت میں کائنات کے اندر مختلف چیزوں میں کوئی مشترک صفت ہی باقی نہیں رہتا جس کا مبداء واحد قیوم قرار دیا جائے۔حالانکہ ایک عام آدمی سمجھ سکتا ہے ، کہ وجود یا جس کو ہم (Existance) کہتے ہیں وہ موجود آدمی اور موجود گھوڑے میں مشترک ہے۔ یہ بات ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ پوچھا جائے کہ خود ایک آدمی کے عدم (Non existance) اور موجود (Existance) ہونے میں جو فرق ہے کیا وہ اُسی طرح کا فرق ہے جو کہ موجود آدمی اور موجود گھوڑے میں پایا جاتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ نہ ہونے اور ہونے میں جو فرق ہے وہی وجود (Existance) کہلاتا ہے۔اس طرح پوری کائنات کی ہر چیز میں ہونا وجود(Existance)مشترک ہے اور اسی مشترک اثر کا مشترک مبداء (Orgin) قیوم کہلاتا ہے۔

حضرت شیخ ابو الحسن الاشعری کے ماننے والے جن کو اشاعرہ کہا جاتا ہے وہ خدا کی

ذات کا دیدار اس لئے ممکن بتاتے ہیں کہ تمام اعراض و جواہر کی ہویتوں کو انسان دیکھتا ہے اور خدا بھی چونکہ ہویت ہے اس لئے اس کا دیدار ممکن ہے۔اس لئے غور کرنے کی بات ہے کہ اشاعرہ کی یہ دلیل اسی بات پر تو مبنی ہے کہ واجب اور ممکن دونوں میں ہویت (شخصیت) کا ہونا مشترک ہے اور رویت اور دید کی بنیاد صرف ہویت پر ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن ہے۔

نوٹ۔اس آخری بحث کی مزید تفصیل آنے والی کتابچے میں نوٹ فرمائیے۔

معیار انسانیت اور اس کے حصول کا طریقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ ○ اَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ وَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی بَلْ تُؤْثِرُوْنَ
الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی ○

بزرگوں اور دوستو! یہ حقیقت کی بات ہے کہ اللہ کی ماننے اور اللہ کے رسول ﷺ کی ماننے سے دنیا اور آخرت دونوں کا فائدہ ہوتا ہے اس میں کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی تو جو شخص بھی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی بات کرے گا تو اس کی بات پر عمل کرنے سے یقیناً نفع ہو گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے تو بات کر نہیں رہا ہو گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کر رہا ہو گا، اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی طرف سے کر رہا ہو گا۔ ہمارا دین بالکل واضح ہے، فطری ہے، مکمل ہے۔ اس پر عمل کرنے سے دنیا اور آخرت دونوں میں نفع ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ تھوڑی دیر میں یہ ساری بات واضح ہو جائے گی۔

مقصدِ زندگی کی پہچان

جب بھی کوئی کام ہوتا ہے، کوئی Project ہوتا ہے تو اس میں جو Project والے ہوتے ہیں وہ کامیابی چاہتے ہیں۔ پھر اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے Procedures ہوتے ہیں ان کو Follow کیا جاتا ہے، پھر اپنے اوپر Checks لگائے جاتے ہیں کہ کہیں میں مطلوبہ Procedure سے Deviate تو نہیں کر رہا۔ اگر کچھ Deviation ہوتی ہے تو اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر بھی ہر وقت خطرہ میں ہوتا ہے کہ کہیں میرا Project ناکام نہ ہو جائے اور دعائیں مانگتا رہتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دے۔ تو ہماری زندگی کا سب سے بڑا Project یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کے اندر جو ہمیں بھیجا گیا ہے جو ہمارا اصل Target ہے کہ ہم اللہ پاک کو راضی کر لیں تو ہم اس میں کامیاب دنیا سے چلے جائیں۔ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے اوپر یہ حالت اتنی زیادہ طاری ہوتی تھی کہ اگر ان سے کوئی پوچھتا کہ تیری داڑھی اچھی ہے یا میرے کتے کی دُم؟ تو وہ فرماتے

اگر میں یہاں سے ایمان کے ساتھ چلا گیا پھر تو میری داڑھی اچھی ہے اور اگر ایمان کے ساتھ نہیں گیا تو پھر تیرے کتے کا دُم اچھا ہے کیونکہ آگ میں تو نہیں جلے گی۔ کتا تو غیر مکلف ہے آگ میں تو نہیں جلے گا۔ یہ اصل میں اس چیز کو مستحضر رکھنا، ذہن میں رکھنا یہ بہت ہی اہم بات ہے کیونکہ ہمارا یہ Project ایسا ہے کہ خدانخواستہ ناکام ہو گیا تو پھر کامیابی کی کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ وہاں سے دوبارہ واپسی کا امکان نہیں ہے۔ اس لحاظ سے پھونک پھونک کر قدم رکھنا، سوچ سمجھ کر ہر کام کرنا اور Guidance لیتے لیتے اس کو تکمیل تک پہنچانا یہ بہت اہم بات ہے۔ ضروری بات ہے۔

انسانیت کے مقام کی پہچان

ابھی سب سے پہلے ہم اپنے آپ کو Judge کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ یہ بھی پہلی بات ہوتی ہے کیونکہ انسان اگر اپنے وسائل کا اندازہ نہیں لگاتا تو وہ صحیح کام نہیں کر سکتا۔ اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ یعنی پہلے یہ بتایا گیا کہ انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کے پیدا کیا گیا ہے لہٰذا یہ بیرونی اور اندرونی طور پر ایسی صلاحیتوں والا ہے کہ اگر اپنی صلاحیتوں کو صحیح استعمال کر لے تو فرشتے بھی اس پر رشک کریں گے اور خدانخواستہ اگر ان صلاحیتوں کی ناقدری کر لی اور اپنے آپ کو ضائع کیا تو شیطان اتنا خطرناک نہیں ہو گا جتنا یہ خطرناک ہو گا۔ آپ ذرا سوچیں کہ یہ بات کیسی ہو سکتی ہے؟ اللہ جل شانہ نے شیطان کے شر کو صرف وسوسے تک محدود کیا ہے وسوسے سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کرنا بھی چاہے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر باقی دروازے بند کئے ہیں۔ لیکن انسان اگر شیطان بن جائے تو اُس کے ساتھ اُس کی وہ تمام چیزیں ہوں گی۔ اُس کی طاقت، اس کا رسوخ، اس کا قلم، اس کا پیسہ۔ اس کی ہر چیز شیطانیت کے لئے استعمال ہو گی۔ لہٰذا وہ انتہائی درجے کا خطرناک بن جائے گا۔ تھوڑا سا غور کر لیں میرے خیال میں ہمارے سامنے مثالیں موجود ہیں۔ یہود کو اللہ پاک نے منتخب لوگوں میں پیدا کیا تھا۔ منتخب لوگ تھے اتنی زیادہ صلاحیتیں تھیں ابھی بھی وہ صلاحیتیں نظر آ رہی ہیں۔ مطلب یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ڈھکی چھپی بات ہے ابھی بھی ن میں وہ صلاحیتیں نظر آ رہی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو

منفی طریقے پہ استعمال کیا تو الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" ہو گئے " الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" بن گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ چونکہ ان کے اندر یہ صلاحیتیں تھیں جیسے ایک گاڑی بڑی پاور فل ہو اگر آپ اس کو صحیح چیز کے لئے استعمال کر لیں تو وہ کام بہت اچھا کرے گی اور اگر غلط طریقے کے لئے استعمال ہو جائے تو وہ کام کرے گی۔ تو اب ان کا جو ذہن ہے شیطانی طور پہ استعمال ہوتا ہے اور پوری دنیا کو نچا رہے ہیں۔ شیطانیت کے لئے ایسا نظام انہوں نے بنا دیا Economy کا کہ ساری دنیا کو اُس میں باندھ لیا ہے۔ کوئی بھی آدمی اس سے نکل نہیں سکتا اور جو نکل سکتا ہے تو ایسا نظام پیچھے بنا دیا کہ اس کو پھر زندہ رہنے کا حق نہیں دیتے۔ یعنی انہوں نے پورا ایک سسٹم Step up کر لیا ہے اور ساری Information کو کنٹرول کر لیا چاہے دنیا میں وہ کتنے ظلم کر لیں وہ سامنے نہ آئیں اور چاہے دوسرے لوگ ان کے ساتھ کچھ بھی نہ کریں وہ سب ظالم نظر آ جائیں۔ یہ ان لوگوں نے Manage کیا ہے۔ تو صلاحیتوں کی بنیاد پر Manage کیا ہے ویسے تو نہیں کیا۔ کوئی اور کر کے دکھائے۔ یہ چیزیں ان کے اندر تھیں تو اسی طریقے سے اللہ پاک نے ہم لوگ کو صلاحیتیں دی ہیں بحیثیت انسان لَقَدْ خَلَقْنَا الاِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيم لیکن اس کے بعد پھر فرمایا ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْن کہ اگر کوئی ان کو غلط استعمال کرے گا تو پھر ہم اس کو نیچوں سے نیچا کر دیں گے۔ یعنی اس کے بعد مثال کے طور پر جانور ہے تو جانور تو غیر مکلف ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے اس کی جبلت جو بھی ہوتی ہے اس جبلت کے مطابق وہ کام کرتا ہے۔ تو اگر انسان انسان ہو کر جانور کی طرح کام کرے تو وہ تو جبلت کے طور پر نہیں وہ تو شعوری طور پہ کر رہا ہے اپنے نفس کی وجہ سے کر رہا ہے تو پھر اس کے لئے سزا ہے۔ جانور کے لئے کوئی سزا نہیں ہے کیوں ظاہر ہے اپنی جبلت کے مطابق کام کر رہا ہے۔

دنیا سے آخرت اچھی بھی ہے اور باقی بھی ہے

میں نے دو آیت کریمہ تلاوت کی ہیں اس کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى بلکہ تم اس دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت اچھی بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے۔ یقیناً یہ ہم لوگوں کی کمزوری ہے ، ناسمجھی ہے، بیوقوفی ہے اور یہ سارا کچھ تربیت کے نہ ہونے کی

وجہ سے ہے کہ ہم آخرت کی زندگی کو ترجیح نہیں دیتے اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کی حیثیت

میں صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں اس سے بات تھوڑی سی واضح ہو جائے گی مثلاً ایک شخص ہے اس کو یہ کہا جائے کہ تین منٹ میری بات مان لے اور پھر باقی دن جو تم کہو گے وہی کیا جائے گا یا تین منٹ تو اپنی من مانی کر لے اور پھر تیرے ساتھ جو ہم کرنا چاہیں گے ہم کریں گے اس وقت عقلمند کیا کرے گا؟ جو عقلمند ہو گا وہ اس کو دیکھے گا کہ مجھے زیادہ فائدہ کونسی بات میں ہے؟ پتہ چلے گا کہ تین منٹ تو باقی چوبیس گھنٹے کے مقابلے میں بہت تھوڑے ہیں تو وہ تین منٹ کی بات کو نہیں لے گا بلکہ وہ باقی وقت کی بات لے گا۔ وہ کہے گا کہ تین منٹ کا تو پتہ نہیں کہ تکلیف دے گا یا نہیں لیکن نہیں مانا تو دوسری صورت میں یقیناً تکلیف ہے اور وہ تکلیف بھی معمولی تکلیف نہیں بہت زیادہ تکلیف ہے۔ جب یہ والی بات سمجھ میں آ گئی تو یہ میں نے مثال دی ہے۔ آخرت کا جو پہلا دن ہے وہ پچاس ہزار سال کا ہے۔ پچاس ہزار سال کو اگر آپ چوبیس گھنٹے مان لیں تو ہماری سو سال کی زندگی اس کے مقابلے میں تین منٹ کی بن جاتی ہے۔ تو اگر صرف ایک دن کے ساتھ حساب کیا جائے تو ہماری پوری زندگی تین منٹ کی بن گئی۔ کیا ہم تین منٹ کی زندگی اچھی کرنا چاہیں گے یا باقی جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اُس کو اچھا کرنا چاہیں گے؟

آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کی مثال

آخرت صرف ایک دن کی بات تھوڑی ہے؟ وہ آخرت کی زندگی جب شروع ہو جائے گی تو اس کے بعد تو پھر ختم ہی نہیں ہو گی۔ بہت بڑی چیز بھی انسان کی سمجھ میں نہیں آتی اور بہت چھوٹی چیز بھی انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہت بڑی چیز کو چھوٹا کر کے سمجھا جاتا ہے اور بہت چھوٹی چیز کو تھوڑا سا بڑا کر کے سمجھا جاتا ہے۔ تو اس کو سمجھنے کے لئے کچھ لوگوں نے مثال دی ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ زمین اور آسمان کے درمیان جو خلا ہے اگر اس کو رائے کے دانوں سے بھر دیا جائے اور ایک پرندہ آئے اور اس سے ایک دانہ رائی کا ایک ہزار سال کے بعد اٹھا کر لے جائے تو ایک دن یہ سارے دانے ختم ہو جائیں گے لیکن آخرت کی زندگی ختم نہیں ہو گی۔ اس وجہ سے جو آخرت کی زندگی ہے

اس کے لئے جو اللہ پاک نے فرمایا کہ وہ اچھی بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے۔اس سے ہمیں یہ سبق حاصل کرنا چاہئے کہ آخرت کے لئے کام کرنا چاہئے اور دنیا میں تو ہم لوگ امتحان کے لئے آئے ہیں تو جس طریقے سے زندگی گزارنے کا فرمایا گیا ہے اسی طریقے سے ہم زندگی گزاریں۔

وہ کیسی زندگی ہے جو ہم گزاریں

اب سوال یہ ہے وہ کیسی زندگی ہے جو ہم گزاریں؟ تو اللہ جل شانہ نے ہمارے لئے ایک نمونہ بھیج دیا کہ اگر چیک کرنا چاہتے ہو اپنے آپ کو تو اس کے ساتھ چیک کرو۔ ہماری Engineering میں ایک Term ہے Feedback control system یعنی اس سے یہ ہوتا ہے کہ انسان Output کو جو مطلوبہ output ہے اس کے ساتھ Compare کرتا ہے اس سے جو Error آتا ہے اس Error کو واپس بھیجتا ہے اور Input کو اس کے ذریعے سے تبدیل کرتا ہے تاکہ مطلوبہ Output آجائے۔ یہ مطلب ایک نظام ہے۔ ہمارا جو Steering ہے وہ اسی طریقے سے چلتا ہے اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں۔ تو اللہ پاک نے ہمیں ایک نظام دے دیا کہ یہ میرا مطلوبہ سسٹم ہے اور وہ ہے آپ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کی سیرت۔ اللہ پاک نے فرمایا "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" البتہ بالتحقیق تمہارے لئے آپ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ اب اگر کوئی اپنی زندگی کو آپ ﷺ کی زندگی کے ساتھ Compare کر لے کہ میری کتنی افراط ہے اور کتنی تفریط ہے اس کے ذریعے سے اپنے آپ کو Judge کر لے اور پھر اپنے جو اعمال کو اس کے مطابق کر لے تو سو فیصد کامیاب ہو جائے گا ان شاء اللہ۔سو فیصد کامیاب ہو گا اور اگر ایسا نہیں کرتا تو پھر نقصان کا ذمہ دار وہی ہے۔ آپ ﷺ کا طریقہ ہر چیز کے اندر جاری و ساری ہے۔

آپ ﷺ کی سیرت کی حفاظت کا نظام

اللہ جل شانہ کا چونکہ نظام ایسا تھا کہ قیامت تک آپ ﷺ کی تعلیمات کو باقی رکھنا ہے تو ایسا انتظام اللہ پاک نے کیا کہ آپ ﷺ کی زندگی کے تفصیلات پورے کے پورے اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر دیئے ہیں۔ کوئی گوشہ آپ ﷺ کی زندگی کا ایسا نہیں ہے جو چُھپا ہوا

ہو۔ سب چیزیں لکھی ہوئی ہیں احادیث شریفہ اس کی موجود ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی ذاتی زندگی کے وہ واقعات بھی محفوظ ہیں جو کوئی کسی کو بتا نہیں سکتا لیکن آپ ﷺ کی محفوظ کر دی گئی کیونکہ اس میں بھی آپ ﷺ کا طریقہ لازمی تھا تو لہٰذا آپ ﷺ کی وہ چیزیں بھی محفوظ ہو گئیں۔ یہ جو بات میں عرض کر رہا ہوں کہ اللہ پاک نے قرآن کو بھی محفوظ کر لیا اس میں بھی کوئی Change نہیں کر سکتا، آپ ﷺ کی احادیث شریفہ کو بھی محفوظ کیا۔ دنیا میں کہیں پر بھی وہ علم نہیں ہے جو احادیث شریف کے اندر ہے اور اس کو رجال کا علم کہتے ہیں۔ یعنی آپ آج بھی کسی بھی حدیث شریف کے رجال معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ کیسے ہیں؟ ان کی ہسٹری کیا تھی؟ اس پر کتنا اعتماد کیا گیا ہے۔ یہ ساری چیزیں آج بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ آپ ﷺ کی سیرت کو محفوظ کرنا اس لئے تھا کہ اس کے ذریعے سے باقی لوگوں کے اعمال کو چیک کرنا تھا کہ کون سا ٹھیک ہے اور کون سا غلط ہے۔ پھر آپ ﷺ کی سیرت کو محفوظ کرنے کے لئے اللہ پاک نے پوری جماعت کو تیار فرما دیا جو جماعت صحابہ ہے۔ یعنی آپ ﷺ کے جو صحابہ ہیں انہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی محفوظ کر دیئے ہر ہر چیز کے اندر یعنی ایک صحابی رسول ﷺ دوسرے لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ ہمیں آپ ﷺ نے رفع حاجت کا طریقہ بھی بتایا ہے یعنی یہاں تک Guidance موجود تھی۔ بیت الخلاء جانا، بیت الخلاء سے باہر آنا، کس طرح سونا، کس طرح جاگنا، یہ سارے طریقے آپ ﷺ کی محفوظ ہیں۔ اس وجہ سے اگر آپ ﷺ کی سیرت کو عمل کی نیت سے پڑھ کر اس پر عمل کیا جائے تو اس میں ہماری سراسر کامیابی ہے کیونکہ بہترین زندگی کا جو نمونہ ہے وہ آپ ﷺ کی زندگی ہے۔

باوجود جاننے کے سنت کی پیروی سے عملاً محرومی کیوں؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے دنیا میں اتنے بڑے عقلمند ہیں ایک سے ایک بڑھ کر عقلمند جن کو ہم عقلمند کہتے ہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ بھی عقلمند کہتا ہے یا نہیں کہتا اس کے بارے میں ابھی بات نہیں کر رہا۔ لیکن جن کو ہم عقلمند کہتے ہیں وہ ایک سے بڑھ کر ایک عقلمند موجود ہیں اور یہ باتیں جو میں نے ابھی کی ہیں کیا یہ سمجھ میں نہیں آ رہی؟ کوئی اس میں ایسی بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکتی ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کو اپنایا

نہیں جاتا اور اپنی مرضی کی زندگی کو گزارا جاتا ہے؟ ہم لوگ اغیار کی پیروی کرنے میں تو آسانی محسوس کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی پیروی کو ہم مشکل محسوس کرتے ہیں وجہ کیا ہے؟اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت کی بات ہے مطلب ظاہر ہے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے لیکن آپ دیکھ لے کہ آپ ﷺ کی زندگی کے بارے میں اگر کوئی بات کر لے تو بعض لوگوں کے ماتھے پر بل آجاتا ہے زبان سے کچھ کہتے نہیں لیکن چہرے پر یہ تاثر آجاتا ہے کہ پتا نہیں یہ کس زمانے کی بات کر رہا ہے ہمیں کس دور میں لے جانا چاہتا ہے؟ کیا یہ وہی دور ہے؟

سنت سے بغاوت پر اعمال کا ضائع ہونا

آپ ﷺ نے فرمایا"صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي" نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو۔ اب آپ ﷺ کی نماز باقاعدہ محفوظ ہے جو ہم نماز پڑھتے ہیں ظاہر ہے ہم اُسی کو Follow کرتے ہیں اسی کے مطابق پڑھنا چاہئے لیکن شیطان اس طرح نہیں کرنے دیتا۔ میں آپ کو مثال دیتا ہوں ، ویسے بڑی عجیب مثال ہے لیکن کیا کریں بعض دفعہ بتانا پڑتا ہے۔ کبھی کسی کونے میں کھڑے ہو جائیں اور جو لوگ جیسے نماز پڑھ رہے ہوں تھوڑا سا ان کا نظارہ کر لیں کہ لوگ کیسے نماز پڑھ رہے ہیں مثلاً ایک شخص قیام کی حالت میں ہے اور رکوع کی حالت میں چلا گیا اب طریقہ کیا ہے کہ دوبارہ پورا کھڑا ہو گا جس کو قومہ کہتے ہیں اور پھر وہاں سے جائے گا سجدے میں اس طرح جلسہ میں پورا بیٹھنا ہو گا پھر دوسرے سجدے میں جائے گا۔ دوسروں کا تو نہیں کہہ سکتا میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ساٹھ ساٹھ پینسٹھ ستر سال کے لوگوں کو میں نے دیکھا ہے متشرع لوگ یعنی یہ بھی نہیں کہ کوئی مزدور یا اس طرح ادھر ادھر نہیں متشرع لوگ ٹھیک طریقے سے قومہ اور جلسہ ٹھیک نہیں کرتے۔ سجدے سے اٹھے ابھی بیٹھے نہیں ہیں کہ دوسرے سجدے میں چلے گئے۔ اس طرح رکوع سے ابھی پوری طرح کھڑے نہیں ہوئے کہ سجدے میں چلے گئے۔ یہ قومہ اور جلسہ واجب ہے مستحب نہیں ہے اور واجب کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اگر رہ جائے اور وہ بھی غلطی سے اگر رہ جائے تو نماز کے اندر آپ کے پاس ایک گنجائش ہے کہ آپ سجدہ سہو کر لیں تو آپ کی نماز درست ہو جائے گی ورنہ پھر نماز دوبارہ لوٹانی پڑے

گی۔تو جو ساری عمر کی نمازیں اس طرح پڑھتا آ رہا ہو ان کے بارے میں کیا خیال ہے تو ظاہر ہے مطلب یہ چیز تو یہ ہے اب ذرہ Calculate کر لیں تھوڑا سا خود ہی Calculate کر لیں ایک شخص پوری نماز پڑھتا ہے اور دوسرا نماز اس طرح نماز پڑھ رہا ہے کہ اُس میں جلسہ اور قومہ کا خیال نہیں کرتا تو اگر چار رکعت کے اندر وہ ایک منٹ سے زیادہ فرق ڈال سکا تو پھر بتا دینا۔ مثال کے طور پر اگر چھ منٹ میں چار رکعت پڑھ رہا ہے پوری صحیح نماز تو زیادہ سے زیادہ اگر یہ پڑھے گا تو پانچ منٹ میں پڑھ لے گا۔اس ایک منٹ نے اس کو کیا دیا؟ اس کی اتنی قیمتی چیز ضائع ہو گئی اور صرف ایک منٹ کی بنیاد پر۔ ہمارے دفتر کے لوگوں نے ایک تجربہ کیا تھا گاڑیاں چلتی تھیں ہماری تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹہ لگتا تھا شہر سے ہمارے سٹیشن پہ پہنچنے میں تو اس میں بعض ڈرائیور بہت تیزی کے ساتھ گاڑی بھگاتے تھے اور بعض نارمل رفتار سے چلتے تھے۔ تو انہوں نے یہ تجربہ کیا کہ جو تیز بھگاتے ہیں وہ کتنا منٹ پہلے پہنچ جاتے ہیں حساب لگایا گیا کہ جو تیز ترین لوگ تھے وہ پانچ منٹ پہلے پہنچ جاتے تھے تو ان کو بتایا گیا کہ پانچ منٹ پہلے پہنچ کر آپ نے کون سا تیر مارا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگیوں کو خطرہ میں ڈالا تو پانچ منٹ سے آپ کو کیا فائدہ ہوا؟ تو اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ اگر تھوڑا سا Realistic calculation کر لیں تو صرف اور صرف نفس کی شرارت ہے اور کچھ نہیں ہے ورنہ ایک منٹ بچا کر ہم کیا کر رہے ہیں تو ایک تو ہم اپنی نمازوں کو درست کر لیں الصلوۃ معراج المؤمنین۔ نماز مومنین کی معراج ہے اللہ پاک فرماتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ نہیں پیدا کیا میں نے جنات اور انسانوں کو مگر اپنی عبادت کے لئے۔ یعنی جو ہماری وجہ تخلیق ہے اگر اس کے ساتھ بھی ہم انصاف نہیں کر سکتے تو پھر کس چیز کے ساتھ انصاف کریں گے؟ یہ بات میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہم اپنی نمازوں کو ضائع کرتے ہیں، اپنے روزوں کو ضائع کرتے ہیں۔ روزوں کو کیسے ضائع کرتے ہیں؟ روزوں کو اس طرح ضائع کرتے ہیں کہ دیکھیں جو کھانا ہم عام کھاتے ہیں اور رمضان شریف میں نہیں کھاتے روزے میں نہیں کھاتے وہ کھانا حلال ہوتا ہے یا حرام ہوتا ہے؟ حلال ہوتا ہے۔تو حلال سے تو رُک جاتے ہیں، جھوٹ بولنا حلال ہے یا حرام ہے؟ غیبت کرنا حلال ہے یا حرم ہے؟ دھوکہ دینا حلال ہے یا حرام ہے؟ اب یہ ساری چیزیں حرام ہیں لیکن ہم لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے حلال سے تو روزہ

رکھا اور حرام کو نہیں چھوڑا۔ آپ ﷺ کے وقت میں دو عورتوں کو روزہ لگ گیا آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی آپ ﷺ نے ان کے پاس ایک برتن بھیجا کہ اس کے اندر قے کریں۔ قے کیا تو اس میں سے گوشت کے قطرے برآمد ہوئے۔ ان عورتوں نے گوشت نہیں کھایا تھا۔اب وہ عورتیں بھی حیرت کر رہی ہیں کہ کیا بات ہے اور باقی لوگ بھی حیرت میں ہے کہ یہ کیا بات ہے؟ آپ ﷺ کو بات پہنچائی گئی آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں نے اللہ کی حلال چیزوں سے تو روزہ رکھا لیکن حرام چیزوں غیبت سے روزہ نہیں رکھا۔یہ غیبت کر رہی تھیں اور چونکہ قرآن پاک میں غیبت کے بارے میں فرمایا کہ یہ اپنے بھائی کا گوشت کھانا ہے وہ متمثل ہو گیا۔ اس طرح ہم زکوٰۃ کو لے لیں، حج کو لے لیں۔یقین جانیے حج کو تو ہم لوگوں نے تماشا بنایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ ایک دفعہ ہمارے ساتھ حج میں ایک بوڑھا آدمی اور اس کی بیوی شامل تھے۔ گیارویں ذو الحج کو دس بجے آ گیا کہ جی میں نے کنکر مار لیا۔ میں نے کہا ابھی تو وقت ہی داخل نہیں ہوا۔زوال کے بعد مارنی ہوتی ہے۔ تو مجھے کیا کہتے ہیں؟ آپ سن لیں اور اچھی طرح سن لیں۔ کہتے ہیں ایک دفعہ ایک آدمی نے شریعت کے مطابق صحیح حج کیا تھا اس کا حج قبول نہیں ہوا اور دوسرے آدمی نے صحیح نہیں کیا تھا اور اُس کا حج قبول ہو گیا۔ اب بتاؤ اس کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس کا حج قبول نہیں ہوا اور اس کا حج قبول ہو گیا؟ کیا وہ پیغمبر ہے؟ عجیب و غریب باتیں لوگوں نے مشہور کی ہیں اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے۔ بھئی اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ باغی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری بغاوت کو دور فرما دے ہم لوگ باغی ہیں ہمیں توبہ کرنا چاہئے۔لیکن یہ بغاوت کیسے ختم ہو گی؟ یہ بغاوت باتوں سے ختم نہیں ہو گی۔ آج میں نے توبہ کر لیا کل پھر وہی حال۔ ٹھیک ہے بہرحال گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اصلاحی نظام سے شیطان کی دشمنی

اس میں کوئی شک نہیں توبہ سے گذشتہ گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں لیکن جس چیز کی وجہ سے گناہ ہوا تھا وہ چیز ہی ختم ہو جائے اور دوبارہ ایسا نہ ہو تو یہ کتنی اچھی بات ہو گی ؟اس کے لئے ایک محنت ہے اس محنت کو آج کل بہت بد نام کیا گیا ہے اور بد نام کرانے میں بھی ظاہر ہے شیطان کا ہاتھ ہے۔ ماشاء اللہ آپ سب ہوشیار لوگ ہیں اگر میں آپ

سے سوال پوچھوں کہ کیا سارے ڈاکٹر صحیح ہیں آپ کا جواب کیا ہو گا؟ نہیں سارے ڈاکٹر صحیح نہیں ہیں۔ کیا سارے دکاندار صحیح ہیں؟ نہیں سب صحیح نہیں ہیں۔ کیا سارے انجینئر صحیح ہیں؟ کیا خیال ہے جب پتہ ہے کہ خراب ڈاکٹر بھی ہیں صحیح ڈاکٹر بھی ہیں تو جب ہم بیمار ہو جاتے ہیں تو کن کے پاس جاتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اچھے ڈاکٹروں کو تلاش کر لیتے ہیں۔ حیدر آباد میں مجھے ایک ساتھی لوگوں سے ملا رہا تھا تو ایک جگہ بہت اچھا محلہ تھا۔ بڑے اچھے مکان بنے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کن کا محلہ ہے؟ اس نے کہا قصائیوں کا۔ میں نے کہا یہاں قصائی اتنے مالدار ہیں؟ تو کہا نہیں ڈاکٹروں کا ہے۔ وہ ناراض ہو گا ڈاکٹروں سے تو غصہ ہو گا۔ تو میں نے کہا اچھا جب آپ بیمار ہو جاتے ہیں تو پھر کہاں جاتے ہیں؟ کہتے ہیں انہی کے پاس آتے ہیں۔ میں نے کہا ان کے پاس کیوں آتے ہیں یہ تو قصائی ہیں؟ کہتے ہیں کیا کریں انہی میں کچھ ڈھونڈ لیتے ہیں کچھ اچھے ہوں تو ڈھونڈ لیتے ہیں جائیں تو کہاں جائیں؟ میں نے کہا اگر یہ بات میں آپ سے کہوں کہ اپنی تربیت کے لئے آپ مشائخ کے پاس جائیں تو اس وقت تو آپ کہتے ہیں سارے مشائخ خراب ہیں سارے پیر غلط ہیں تو یہی بات جو آپ ڈاکٹر کے انتخاب میں سوچتے ہیں شیخ کے انتخاب میں کیوں نہیں سوچ سکتے کہ سارے غلط نہیں ہیں جو غلط ہیں وہ غلط ہیں جو صحیح ہیں وہ صحیح ہیں تو آپ خواہ مخواہ اپنے آپ کو کیوں محروم کرتے ہیں؟ تو یہ جو بات میں عرض کر رہا ہوں یہ بہت اہم بات ہے کہ اس کو واقعی بد نام کیا گیا ہے۔

شیطان کی اصلاح ممکن نہیں

ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے نفس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے شیطان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے شیطان کی اصلاح ممکن نہیں اس نے اپنا کام کرنا ہے جو کرنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس کی نہ مانیں۔ لیکن اس نے جو کرنا ہے وہ کرنا ہے اس کو ہم ٹھیک نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے آپ کو ٹھیک کرنا پڑے گا دشمن دشمن ہوتا ہے چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ دشمن سے بچنا ہوتا ہے دشمن کو ٹھیک اگر نہیں تو دشمن سے بچنا ہوتا ہے بس تو اس شیطان کے بارے میں یہ بات پکی ہے اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْن۔ بے شک شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے ہمیشہ کے لئے۔ جب یہ والی بات سمجھ میں آ گئی تو شیطان سے بچنا لازمی ہو

گیا۔ کیسے بچ سکتے ہیں؟

شیطان کا پہلا توڑ ذکر اللہ ہے

جو دشمن ہوتا ہے وہ کیا کرتا ہے؟ دشمن اگر ہمیں ہمارے اوپر حملہ کرے تو پہلا کام اس کا کیا ہو گا؟ وہ ہم سے ہمارا اسلحہ ضبط گا۔ ایک ملک کا دوسرے ملک پر حملہ ہو گا تو ہوائی اڈوں پر پہلے حملہ کرے گا کہ وہاں سے کوئی جہاز نہ اُڑ سکے یہی طریقہ ہوتا ہے۔ تو شیطان کا سب سے پہلا حملہ اس پر ہو گا جو اس کے خلاف جاتا ہے تو یہ آپ کو بتا دوں کہ شیطان کے خلاف سب سے بڑا وار جو ہے وہ ذکر کا ہے۔تو شیطان سب سے پہلے ذکر سے منع کرے گا۔اس کے بارے میں وسوسے ڈالے گا تا کہ کوئی ذکر نہ کر سکے۔کیونکہ شیطان غافل پر وار کرتا ہے۔فرمایا کہ انسان کا دل جو ہے اس پر شیطان مچھر کی طرح بیٹھا ہوتا ہے اور جیسے ہی انسان ذکر شروع کرتا ہے تو پیچھے ہو جاتا ہے اور جس وقت ذکر نہیں کرتا غافل ہوتا ہے تو اپنے وساوس اس کے دل میں ڈالتا ہے۔ تو اگر ہم نے شیطان سے بچنا ہے تو ذکر کرتے رہیں تا کہ شیطان ہمارے قریب بھی نہ آئے" لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" آیت الکرسی" وہ جو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے شیطان کو پکڑا تھا اور شیطان نے کہا تھا کہ میں تمھیں ایک طریقہ بتاتا ہوں جس کے ذریعے سے تم مجھ سے بچ سکتے ہو صحابی نے پوچھا کہ بتاؤ؟ تو شیطان نے کہا آیت الکرسی پڑھو گے تو پھر میں تیرے اوپر حملہ آور نہیں ہو سکوں گا۔ توجب ان صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جھوٹے نے سچ کہا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لئے کچھ اس قسم کی حفاظتی بندوبست کرنی چاہئے۔ہم نماز پڑھتے ہیں نماز پڑھ کر ہم فوراً اٹھ جاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔حالانکہ ہمارے پاس زبردست موقع ہے اس موقع سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ نماز کے بعد اگر کوئی آیت الکرسی پڑھ لے تو اگر موت آ جائے تو اس کے درمیان اور جنت کے درمیان صرف موت حائل ہے۔کتنی بڑی چیز ہمارے پاس ہے۔لیکن ہمیں بس جلدی ہوتی ہے۔جلدی جلدی جاتے ہیں ہم باہر جا کر کیا کرتے ہیں؟کون سا کام کر رہے ہوتے ہیں؟ اُس کام سے زیادہ تو آیت الکرسی ہے۔اسی طرح اور تسبیحات ہیں ان کو کر کے آدمی اُٹھے۔تو ایک بات میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ذکر کے ذریعے سے انسان شیطان کے حملوں سے بچ سکتا ہے۔

ذکرِ ثوابی

ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک قسم ہے ثوابی ذکر جس سے ثواب ہوتا ہے اس کے لئے آپ کو کسی پیر سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے یہ اللہ پاک نے بھیجا ہے آپ ﷺ نے بتایا ہے سکھایا ہے حدیث شریف میں موجود ہے۔ آپ اپنے وقت کے مطابق اور اپنے استعداد کے مطابق جتنا ذکر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں آج ہی ہم نے ایک حدیث شریف پڑھی "كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي الْمِيزَانِ، حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمَنِ، سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ،" تو یہ حدیث شریف ہم بتاتے ہیں کہ دیکھو اتنے مختصر وقت کا عمل ہے لیکن اللہ کو پیارا ہے اور زبان پر ہلکا ہے اور میزان میں اللہ پاک نے اس کو بہت وزن دیا ہے۔ اور فرمایا" أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ" تو" سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ، کا اگر یہ اجر ہے تو" لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ" کا کیا ہو گا؟ اندازہ لگا سکتے ہیں ہم۔ اسی طرح پھر درود شریف کا، پھر اس کے بعد استغفار کا۔ ایک بزرگ تھے ان کے پاس جو بھی آتا تھا ان سے کہتے تھے استغفار پڑھو تو ان کے ایک ہم عمر ساتھی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا حضرت آپ کو استغفار کے علاوہ کچھ اور بھی آتا ہے آپ ہر ایک کو استغفار بتاتے ہیں۔ تو فرمایا میں اپنے آپ سے تو نہیں بتا رہا میں تو قرآن سے بتا رہا ہوں۔ اب اس کو اور بھی زیادہ تجسس ہو گیا۔ پوچھا کہاں ہے قرآن میں؟ انہوں نے کہا سنو "فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا، وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَارًا، مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا" اس میں سب کچھ آ گیا یا نہیں؟ آیا ساری ہماری جتنی بھی ضروریات ہیں وہ سارا استغفار پورا کر رہی ہے؟ پھر دیکھو اللہ پاک فرماتے ہیں "وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ "میں ان کو کیسے عذاب دوں کہ آپ ان میں ہیں اور یہ استغفار کرنے والے ہیں۔

ثوابی ذکر کی توفیق سے محرومی

تو اس کا مطلب ہے کہ استغفار ہمارے دنیا کے مسائل کا بھی حل ہے استغفار ہمارے آخرت کے مسائل کا بھی حل ہے۔ ہماری دنیا بھی سُکھ کے ساتھ گزرے گی اگر ہم استغفار کرنے والے ہوں اور اللہ جل شانہ آخرت میں بھی ہمیں نوازیں گے۔ تو یہ ساری باتیں

موجود ہیں لیکن شیطان نہیں کرنے دیتا۔اس کے لئے باقاعدہ ایک محنت ہے وہ کرنی پڑتی ہے پھر اس کے بعد توفیق ملتی ہے ورنہ نہیں ملتی۔ توفیق یعنی آپ اندازہ کر لیں مثال کے طور پر آپ کشمیر سے جائیں راولپنڈی تقریباً تین گھنٹے تو لگیں گے اس تین گھنٹے میں میرے اندازے کے مطابق آپ بارہ ہزار مرتبہ " لَااِلٰہَ اِلَّااللہ" پڑھ سکتے ہیں یہ میرا اندازہ ہے۔ رائیونڈ سے میں ایک دفعہ آ رہا تھا تو ان دنوں ٹرین کا نو گھنٹے کا سفر تھا تو ایک گھنٹہ ظاہر ہے میں نے کھانے پینے نماز وغیرہ میں گزارا ہو گا آٹھ گھنٹے اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی اس میں میں نے پینتیس ہزار مرتبہ " لَااِلٰہَ اِلَّااللہ" پڑھا تو پتہ چل گیا کہ فی گھنٹہ کم از کم چار ہزار سے زیادہ ہے۔ لیکن شیطان کرنے کب دے گا؟ آپ نے شروع کر لیا۔اُس وقت آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے اپنی سیٹ پر بیٹھے اور کیا کر سکتے ہیں لیکن شیطان آپ کو اِدھر اُدھر مصروف کر دے گا کبھی کہے گا یہ دیکھو، کبھی کہے گا وہ دیکھو۔ کبھی کیا کبھی کیا۔ کبھی اخبار پڑھو۔ آپ ذکر شروع بھی کر لیں پھر بھی آپ کے ذہن کو آگے پیچھے کر لے گا کیونکہ شیطان آپ کو ذکر نہیں کرنے دے رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے حدیث شریف میں آتا ہے شیطان غافل دل پہ attack کرتا ہے۔ وسوسے تب ڈالتا ہے جب انسان غافل ہو۔ جس وقت انسان ذکر کرتا ہے شیطان پیچھے ہو جاتا ہے۔جس وقت غفلت میں ہوتا ہے وہ حملہ کر لیتا ہے یہ تو ہو گیا ایک ذکر جو ثوابی ہے۔

علاجی ذکر

دوسرا ذکر علاجی ہے۔ علاجی ذکر کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر چیز کے لئے کوئی صفائی کا آلہ ہوتا ہے دلوں کی صفائی کا آلہ ذکر اللہ ہے لکل شی صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ تعالیٰ۔اس سے پتہ چلا کہ ذکر سے دل صاف ہوتے ہیں۔ اچھا، دل صاف ہوتے ہیں تو دل میں گندگی کیا چیز ہے؟ وہ کون سی چیز صاف ہوتی ہے؟ تو گندگی اس میں دنیا کی محبت ہے۔ جتنا انسان کے دل میں دنیا کی محبت ہو گی اتنا ہی وہ آخرت سے غافل ہو گا اور اتنا ہی اپنی آخرت کو خراب کرے گا۔

دنیائے مذموم اور دنیائے محمود میں فرق

ایک بات سن لینا چاہئے کہ دنیا کی محبت سے منع کیا گیا ہے دنیا کمانے سے منع نہیں کیا گیا۔دنیا کی محبت سے منع کیا گیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے وقت کے بہت بڑے تاجر

تھے اور بہت بڑے مالدار تھے۔روایات کے مطابق کم از کم تین دفعہ انہوں نے اپنے پیسوں سے جنت خریدا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت اگر کوئی یہ کرے گا تو اس کے لئے جنت تو آگے آتے اور اس کام کو کر لیتے۔ابھی بھی سبحان اللہ سعودی عرب کے اندر ان کا اکاؤنٹ موجود ہے بالکل اکاؤنٹ موجود ہے اور اس میں جو وقف ہے عثمان رضی اللہ عنہ کا وہ باقاعدہ اس کا پیسہ اس میں جمع ہوتا ہے اور وہ پھر تقسیم ہوتا ہے۔ان کا اکاؤنٹ ابھی تک موجود ہے تو عثمان رضی اللہ عنہ ،عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ یہ مالدار لوگ تھے لیکن ان کا مال جو تھا وہ اپنے لئے نہیں تھا۔

حضرت عثمانؓ اور سائل کا واقعہ

ایک دفعہ آپ ﷺ نے ایک صاحب جو سائل تھے ان سے فرمایا کہ جاؤ عثمان کے پاس وہ آپ کی مدد کرے گا۔وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اس وقت شام کا وقت ہو چکا تھا یعنی سونے کا وقت تھا۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آواز باہر آرہی تھی اپنی زوجہ محترمہ سے فرما رہے ہیں کہ میرے خیال میں اس چراغ کو بند کرنا چاہئے کیونکہ اس وقت اس کی ضرورت نہیں ہے ضائع ہو رہاہے۔اِس نے جب یہ سن لیا تو کہا کہ او ہو آپ ﷺ نے تو مجھے اس کے پاس بھیج دیا یہ تو اتنا کنجوس ہے نعوذباللہ من ذلك تیل کا خرچہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تو خیر بہرحال چونکہ مجھے بھیجا گیا ہے تو دروازہ کھٹکھٹایا۔عثمان رضی اللہ عنہ باہر آئے۔ باہر آ کر پوچھا تواُس نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ میری کوئی مدد کریں گے۔ تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے اور اندر گئے اور چیزیں لاتے رہے اور ان کو دے رہے ہیں۔ یہ بھی لے جاؤ، یہ بھی لے جاؤ، یہ بھی لے جاؤ۔ اب وہ حیران ہے کہ کیا وہ بات میں نے غلط سنی ہے یا یہ چیزیں مجھے صحیح نظر نہیں آ رہیں؟ پوچھا حضرت وہ کیا بات اور یہ کیا بات ہے؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا کون سی بات؟ کہا کہ آپ نے ابھی اس طرح کچھ بات نہیں کی تھی؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں کی تھی تو کیا مسئلہ ہے؟ اُس نے کہا تو پھر یہ کیا ہے؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کے بندے اُس کا تو مجھ سے حساب ہو سکتا تھا کیونکہ میں اپنے اوپر خرچ کر رہا تھا اور یہ تو میں اللہ کے راستے میں دے رہا ہوں آپ ﷺ کے حکم کے مطابق دے رہا ہوں اس کا میرے ساتھ حساب کدھر ہو گا؟ اس لئے میں دے رہا ہوں۔بس یہی بات تھی تو ان کا مال کمانا جو تھا وہ اللہ کے لئے تھا لہٰذا وہ ان کے

لئے ماشاء اللہ جنت کا ذریعہ تھا۔ (جاری ہے)

مشکل الفاظ کے معنی

واصل: یعنی جو اُس مقام پر آجائے جس پر آنا ہوتا ہے۔

شنیدہ: جس نے سنا ہو۔

سر بریدہ: جس کا سر کٹا ہوا ہو۔

عترتی: میری اولاد۔

فہیمِ اُمت: امت کو پہچاننے والے۔

سِر: راز۔

ولایتِ صغریٰ: چھوٹی ولایت۔

ولایتِ کُبریٰ: بڑی ولایت۔

جذبِ کسبی: جو جذب محنت سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اصطلاحاتِ قدیمہ

سُکر: کتاب التعریفات المؤلف علی بن محمد بن علی الزین الشریف الجرجانی کے مطابق "السکر هو غیبة بوارد قوی وهو یعطی الطرب والالتذاذ۔ و هو أقوی من الغیبة وأتم منها" یعنی قلب پر کسی وارداتِ قوی کا غلبہ ہو جانے سے غیبت کا طاری ہو جانا یہ خوشی اور لذت کی وجہ سے ہوتا ہے جبکہ سُکر غیبت سے قوی تر اور مکمل ترین ہوتا ہے۔

وحدۃ الوجود: بغیر قصد کے شرعی تشریحات کا ذہن میں نہ ہونا اور ایسی باتوں کا منہ سے نکل جانا جس پر شریعت گرفت کرتی ہو۔

وحدۃ الشہود: اللہ تعالیٰ کی عظمت کا ایسا ادراک کسی کو ہو جائے کہ مخلوق کی موجودگی اس کو محسوس ہی نہ ہو جیسے سورج کی موجودگی میں ستارے نظر نہیں آتے لیکن یہ جانتا ہے کہ ستارے بھی موجود ہیں۔ اسی کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

پدرم سلطان بود: میرا باپ بادشاہ تھا۔

متابعت کی صورت: بظاہر اتباع۔

متابعت کی حقیقت: حقیقی اتباع۔

سیر الی اللہ: سالک جو ابتداء میں روحانی مریض ہوتا ہے، علاج کے لئے مرشد کامل کی طرف رجوع کرتا ہےاور اس میں اطلاع و اتباع کے ذریعے سالک کی روحانی بیماریاں آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہوتی ہیں۔یہاں تک کہ درجہ ضرورت میں سالک کا دل ان بیماریوں سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" یعنی بے شک جس نے نفس کو پاک کیا کامیاب رہا۔ اس کے ساتھ سالک کا قلب اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ ہوا یعنی اس میں تواضع، اخلاص، تفویض، حبِ الٰہی و حبِ رسول اور انابت اِلی اللہ کی صفات پیدا ہوئیں اور اس میں رسوخ حاصل ہوا۔ یعنی ان صفات نے قلب میں جگہ پکڑ لی اوران کو حاصل کرنے کی تدابیر سے آگاہی ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ اس کی سیر الی اللہ کی تکمیل ہوئی۔اس کو آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ طریقِ صحابہ پر آنے کے لئے راستہ ہے۔

ذوق: عقل سے اوپر فہم کی صلاحیت۔

اربابِ ولایت: ولایت والے۔

سالک مجذوب: سلوک کی تکمیل کے بعد جذبِ منتہی جس کو عطا ہو جائے اس کو سالک مجذوب کہتے ہیں۔ اکثر سلسلوں کی ترتیب یہی ہوتی ہے۔

مجذوب سالک: جذبِ مبتدی کے بعد جو سلوک کی تکمیل کروا رہا ہو مجذوب سالک کہلاتا ہے۔ ایسے سالک کو بھی جذبِ منتہی جب عطا ہو جائے تو مجذوب سالک مجذوب کہلاتا ہے۔ نقشبندی کاملین حضرات کی یہی ترتیب ہوتی ہے۔

مبتدی: جس نے اپنی تربیت ابھی شروع کی ہے

منتہی: جس کی تربیت ہوچکی ہو۔

ولایتِ خاصہ: وہ ولایت جو تقویٰ کی بنیاد پر ہو۔

علماء راسخین: جن کو علم میں رسوخ حاصل ہو یعنی حقیقی سمجھ دار۔

تمکینِ قلب: دل کا کسی ایک بات پر ٹھہر جانا۔

کمالاتِ نبوت: نبوت کے کمالات۔

کمالاتِ اولوالعزم: اولو العزم انبیاء کے کمالات۔

تبعیت و وراثت: اتباع اور وراثت کی بنیاد پر جو ملے۔

فنا وبقا: اللہ کے لئے نفس کی فنا اور اللہ کا لوگوں کی اصلاح کے لئے نفسانی خواہشات کا کنٹرول میں واپس کرنا۔

احوال و مواجید: حال اور وجد کی جمع یعنی جو خود بخود بغیرَ ارادے کے کیفیات ہوں

تجلیات و ظہورات: جو تجلیات سامنے آئیں۔

توسل: وسلیلہ پکڑنا۔

بدعتِ حسنہ: اچھی بدعت۔

بدعتِ سیئہ: بری بدعت۔

کمالات کا فیضان: کمالات کا نصیب ہوجانا۔

مقاماتِ عروج: عروج کے مقامات۔

صعود: بلندی پر چڑھنا یعنی عروج حاصل کرنا۔

نزول و ہبوط: نیچے آنا،خاک میں ملنا۔

اتحادِ نسبت: نسبت کا ملنا۔

تغایرِ نسبت: نسبت سے دور ہونا۔

طفیلی و وارث: کسی کے طفیل یا موروثی طور پر کچھ ملنا۔

تابع: جو اتباع کرتا ہے۔

متبوع: جس کی اتباع کی جاتی ہے۔

حیلولہ: حائل ہونا۔

وسیلہ: کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے استعمال ہونے والا ذریعہ۔

مناقب: منقبت(تعریف) کی جمع۔

تواضع: اپنے آپ کو اللہ تعالی کی عظمت کی وجہ سے کم سمجھنا۔

بساطِ قُرب: قرب جس ذریعے سے حاصل۔

سیر مع اللہ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونا۔

طریقت و حقیقت: شریعت پر چلنے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنا طریقت ہے اور اس سے دل کے آنکھوں پر جو نفسانی خواہشات کی پٹی ہے اس کا دور ہونا حقیقت ہے۔

حق الیقین: ملیریا کے عالم کو خود ملیریا ہو جائے تو یہ ملیریا کا حق الیقین حاصل ہونا ہے۔

علم لُدنی: جو علم بغیر اسباب کے اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عطا ہو جائے۔

انانیت: نفس میں گرفتاری۔

وجد: خود بخود کسی باطنی تحریک سے کوئی ظاہری حرکت کا واقع ہونا۔

کشف: زمانے کے اعتبار سے مکان کے اعتبار سے کسی غیبی چیز کا ظاہر ہونا۔

الہام: دل پر کسی چیز کا وارد ہونا۔اس کو وارد بھی کہتے ہیں۔

مطلق : بغیر کسی شرط کے کوئی چیز۔

مقید: مشروط طور پر کوئی چیز۔